روزگارِ فقیر

(شاعرِ مشرق کے واقعات، نادر اشعار اور تصاویر کا مجموعہ)

جلد دوم

فقیر سید وحید الدین

compa
shares
each
his
ly
eriod
ave a
vidence
ares
uch
o
e
ares
no
have
shal
minis
curat
the
seve
net p
isfact
mem
xecut
otativ
n any
exerci
y
the
in Re

روزگارِ فقیر

(شاعرِ مشرق کے واقعات، نادر اشعار اور تصاویر کا مجموعہ)

جلد دوم

از

فقیر سید وحید الدین

لائن آرٹ پریس، لمیٹڈ
فریئر روڈ، کراچی ——— دی مال، لاہور

بار اوّل   نومبر سنہ ۱۹۶۴ء   دو ہزار

قیمت فی مجلد

۱۶ روپے

مطبوعہ   اوپن آرٹ پریس لمیٹڈ، فریر روڈ، کراچی

طابع و ناشر   فقیر سید وحید الدین

شاعرِ مشرق کی خدمت میں ایران کے عظیم دانشور ملک الشعراء بہار کا نذرانۂ عقیدت

بیدلے گر رفت اقبالے رسید
بیدلاں را نوبتِ حالے رسید
قرنِ حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں بر گذشت
ہیکلے گشت از سخن گوئی بپا
گفت کُلّ الصید فی جوف الفرا
شاعراں گشتند جیشے تار و مار
وین مبارز کرد کارِ صد سوار
ہاں سلامے می فرستم سوئے یار
بے ریا تر از نسیمِ نوبہار

اشاریہ

کلامِ اقبال ۲۱۵

فہرست تصاویر حصّۂ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اِفتتاحیہ

اللہ تعالیٰ کے اس کرم بے پایاں کا شکر کس زباں سے ادا کروں، کہ "روزگارِ فقیر" کے نقشِ ثانی کی پہلی جلد میری توقع سے کہیں زیادہ مقبول ہوئی اور ہر طبقے میں پسند کی گئی۔ ملک و بیرونِ ملک کے قارئین، جرائد اور علمی اداروں نے اپنی پسندیدگی اور جذباتِ تحسین کا اظہار مختلف پیرایوں میں کیا۔ یہ قدر شناسی اور عزت افزائی میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کو، جو علامہ کی قربت، ہم نشینی اور صحبت سے فیض یاب ہو چکے ہیں، ملفوظات و مشاہدات قلمبند کرانے کے لیے خاطر خواہ وقت نہ دے سکا اور میں نے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے کتاب کی ترتیب و اشاعت میں اس قدر تیزی و عجلت کو روا رکھا کہ جب کتاب چھپ کر منظرِ عام پر آئی تو احساس ہوا کہ میں اپنی یادداشت میں محفوظ کئی اہم واقعات کو قلمبند نہیں کر سکا اور ان بزرگوں کے گنجینۂ معلومات سے بھی بہت سے

جواہر ریزے حاصل کیے جا سکتے تھے، جن کا محفوظ کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ سِن رسیدہ بزرگوں اور دوستوں کی اس نسل کے بعد ذکرِ اقبال کا یہ دور ہی ختم ہو جائے گا اور پھر اسے کوئی بیان کرنے والا باقی نہ رہے گا۔

"روزگارِ فقیر" کی جلد دوم تین اہم ابواب پر مشتمل ہے:

پہلے باب میں ایسے واقعات اور ملفوظات ہیں جن سے علامہ مرحوم کے اپنے ذاتی واقعات، خاندانی حالات، عشقِ رسولؐ اور مختلف افکار و نظریات پر روشنی پڑتی ہے اور تحقیق کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

باب دوم میں کم و بیش آٹھ سو ایسے اشعار پیش کیے گئے ہیں، جو علامہ کے کسی مجموعۂ کلام یا باقیات و آثار کے موضوع کی کسی کتاب میں اب تک شائع نہیں ہوئے۔

باب سوم "حیاتِ اقبال تصاویر میں" اس کتاب کا نہایت جدت آمیز اور دلچسپ حصہ ہے۔ علامہ کی زندگی اور مصروفیات و مشاغل سے متعلق نادر و نایاب تصاویر کا تلاش کرنا اور انھیں فنِ عکاسی کے اعلیٰ معیار کے مطابق محفوظ و مرتسم کرنا اگرچہ نہایت اہم کام تھا، لیکن اس پر آج تک کسی فرد یا ادارے نے توجّہ نہیں دی تھی۔

میں جناب شیخ اعجاز احمد اور جناب ممتاز حسن کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان مضامین اور تصاویر کی فراہمی کے سلسلے میں میری ہر ممکن معاونت اور حوصلہ افزائی کی اور کتاب کی ترتیب و تدوین کے دوران مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ میرے شوقِ طلب اور ذوقِ جستجو کی کامیابی ان دونوں حضرات

کے پرخلوص تعاون کی رہینِ منت ہے ۔

سراپا شکر و مسرت ہوں کہ مشرق کے عظیم شاعر، مفکرِ اسلام اور عاشقِ رسول کی سیرت و کردار اور افکار و نوادر کا یہ مرقع شائع کرنے کی سعادت مجھے میسر آئی۔ اس خوشگوار فرض کی ادائگی کے بعد ایسا محسوس کر رہا ہوں، جیسے میری زندگی سمٹ کر مجسّم سجدۂ شکر بن گئی ہے ۔

۱۴ اگست سنہ ۱۹۶۴ء

فقیر سید وحیدالدین
۴۳ - روز اسٹریٹ
میکنیل روڈ - کراچی (کینٹ)

واقعات و ملفوظات

خدا کی ہستی

میرے والدِ بزرگوار فقیر سید نجم الدین نے یہ واقعہ سنایا کہ علامہ مرحوم کی قیام گاہ پر چند احباب کی موجودگی میں ایک ملاقاتی یکایک یہ سوال کر بیٹھا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ عالم بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں۔ کیا آپ خدا کی ہستی اور باری تعالیٰ کے وجود کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں؟ علامہ نے اس کے جواب میں "نہیں" کہا۔

ملاقاتی نے اس پر دریافت کیا — جب یہ بات ہے تو پھر آپ کے نزدیک خدا کی حقیقت قابلِ تسلیم کیوں کر ہوئی؟ — علامہ نے فرمایا، یقیناً خدا کی ہستی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اس کے لیے مجھے کسی فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبرؐ نے جن کے متعلق ان کے دشمن بھی کہتے تھے کہ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا جب فرمایا ہے کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے تو خدا کی ہستی یقینی ہے۔

غالب اور رومی سے ملاقات

علامہ پر کبھی کبھی عمیق غور و فکر بلکہ یوں کہیے استغراق کی ایسی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور ماحول سے یکسر غافل ہو جاتے۔ آخر عمر میں اُن کے دل و دماغ پر اس کیفیت کا غلبہ اور زیادہ ہونے لگا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے کمرے میں حسبِ معمول نیم دراز تھے اور کوئی ملاقاتی اُس وقت موجود نہ تھا۔ اپنے دیرینہ خادم علی بخش کی آہٹ سن کر وہ چونک پڑے اور اسے مخاطب کر کے فرمایا:

"علی بخش! میرے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ جلدی جاؤ اور انھیں واپس بلا لاؤ۔ علی بخش ایک فرمانبردار اور سادہ لوح خادم، علامہ کا حکم سُنتے ہی باہر لپکا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بظاہر مرزا غالب کی تلاش میں ناکام واپس آگیا اور کہا" غالب صاحب مجھے نہیں ملے۔"

علامہ نے فرمایا "بخشی! تم کیا کہہ رہے ہو — وہ ابھی تو میرے پاس اس کرسی پر بیٹھے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے ہیں۔"

انتقال سے چند روز قبل بھی اس نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ اس دفعہ انھوں نے مولینا رومیؒ کے متعلق علی بخش سے کہا کہ وہ ابھی میرے پاس سے گئے ہیں۔ انھیں واپس بلا لاؤ۔

اس بار بھی علی بخش مہمان کے خیالی پیکر کو باہر ڈھونڈ کر ناکام واپس آگیا۔

علامہ کے استغراق کی یہ کیفیت تھی کہ انھوں نے نہ اپنی ہدایت پر کوئی توجہ دی، نہ علی بخش کے جواب کو غور و فکر کی اہمیت کا مستحق سمجھا۔

انسانی عقل و دانش کے لیے ان حیران کُن واقعات کے بارے میں علامہ نے کبھی کوئی ایسی بات وضاحت اور قطعیت کے ساتھ نہیں کہی، جس سے اُن کے ساتھ پیش آنے والے ان چھوٹے چھوٹے لیکن اہم واقعات پر روشنی پڑ سکتی۔ لیکن اُنھوں نے اپنی تعلیمات اور افکار میں زندگی میں حاصل ہونے والے ایسے وجدانی لمحات اور محسوسات کا بار بار ذکر کیا ہے۔ جب انسانی قلب و دماغ پر بعض کیفیتوں کا غلبہ ہوتا ہے اور اُس کے غور و فکر کے سلسلے لامحدود وسعتوں سے مربوط یا اُن میں گم ہو جاتے ہیں۔

مصلحتِ خداوندی

میرے والد فقیر سید نجم الدین جن دنوں شرق پور میں متعین تھے، ایک شادی میں شریک ہونے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ علامہ اقبال بھی اس تقریب میں موجود تھے، والد صاحب کے ہمراہ اُن کا ان پڑھ چپراسی بھی تھا۔ چپراسی سے والد صاحب نے کہا "دیکھو، یہی وہ ڈاکٹر اقبال ہیں، جن کا میں اکثر ذکر کیا کرتا ہوں"۔ والد صاحب اپنی نشست سے اُٹھ کر کہیں گئے تو چپراسی نے بڑے ادب کے ساتھ علامہ سے کہنے لگا "میرے پیٹ میں اکثر درد رہتا ہے۔ آپ کوئی دوا بتا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"۔

ڈاکٹر صاحب اس کی اس سادگی پر مسکرا دیے۔ اس مسکراہٹ میں ایک خاص تلطف اور خوش ذوقی بھی شامل تھی۔ ایک شخص جو علامہ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے چپراسی سے کہا کہ یہ جسم کے نہیں، علم کے ڈاکٹر ہیں ــ!

لطیفے کے طور پر یہ واقعہ بھی بعض محفلوں میں سُنا گیا ہے کہ کسی مقام پر "یوم اقبال" منایا جا رہا تھا۔ وہاں ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اقبال نے قوم کے لیے بہت بڑی قربانی دی، ولایت سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے آئے، مگر ایک دن بھی ڈاکٹری کا پیشہ نہیں کیا اور ساری عمر قوم کی خدمت میں گزار دی۔

یہاں یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر سید محمد حسین اور ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک بار میڈیکل کالج میں داخلے کی واقعی کوشش بھی کی تھی۔ سید محمد حسین کو تو داخلہ مل گیا، مگر ڈاکٹر اقبال کسی وجہ سے رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود مجھے سنایا کہ بھئی! میں نے ڈاکٹر بننے کی ایک بار کوشش کی، مگر اُس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی اس میں بہت بڑی مصلحت پنہاں تھی۔ مشیتِ ایزدی علامہ کو جو کچھ بنانا چاہتی تھی، اُس کے پیشِ نظر میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملنا ہی مناسب تھا اور اس ناکامی میں شاندار مستقبل کی کامیابی اور کامرانی مضمر تھی۔ طبی ڈاکٹر بن کر وہ چند ہزار مریضوں کی خدمت کر سکتے تھے، مگر اُنھوں نے فلسفی، مفکر، شاعر بلکہ یوں کہیے حکیم الامت بن کر آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے اسباب مہیا فرما دیے اور حکمت و بصیرت کے نہ بجھنے والے چراغ روشن کر دیے۔

سُرودِ رفتہ

سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دِگر دانائے راز آید کہ ناید

علامہ اقبال کا یہ قطعہ خاص و عام سبھی کو پسند ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ قطعہ ایک زمانے تک "سرودِ رفتہ" کے الفاظ کے ساتھ پڑھا گیا اور اسی طرح مضامین اور کتابوں میں درج ہُوا۔ حالانکہ علامہ کے لکھے ہُوئے اصل الفاظ "سرودِ رفتہ" ہیں "سرودِ رفتہ" نہیں۔

اس غلط فہمی کا آغاز اس طرح ہُوا کہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ کے جنازے کا جلوس جب لاہور کی شاہراہوں سے گزر رہا تھا تو اس موقع پر ایک شخص نے یہ قطعہ جو علامہ انتقال سے کچھ عرصہ قبل کہہ چکے تھے، چھپوا کر تقسیم کیا اور اس میں "سُرودِ رفتہ" املا کیا گیا۔ میں علامہ مرحوم کے جنازے میں شریک تھا۔ دُوسرے حضرات کی طرح مجھے بھی یہ قطعہ "سُرودِ رفتہ" کے الفاظ کے ساتھ یاد رہا۔ اس غلطی پر "ارمغانِ حجاز" کی اشاعت نے مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ علامہ کا یہ مجموعہ اُن کی رحلت کے چند ماہ بعد شائع ہُوا اور اس میں بھی "سُرودِ رفتہ" ہی چھپا۔ چنانچہ

۱۹۵۱ء میں جب میں نے "روزگارِ فقیر" کا نقشِ اوّل پیش کیا تو اُس میں قطعۂ مذکورہ کا پہلا مصرعہ

"سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید"

ہی شائع کیا گیا، جو "ارمغانِ حجاز" کے نسخے کے عین مطابق تھا۔ دُنیا میں "نقل در نقل" کی غلطیاں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں۔

"روزگارِ فقیر" کے نقشِ ثانی کے منظرِ عام پر آنے سے کچھ پہلے حکیم الامت کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس غلط فہمی کی وضاحت کی۔ اُنھوں نے کہا کہ "ارمغانِ حجاز" کا ساتواں ایڈیشن جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے، اُس کے صفحہ ۱۴ پر اس افسوس ناک غلطی کی تصحیح کر دی گئی ہے، لہٰذا "روزگارِ فقیر" میں بھی اس قطعے کو "سُرودِ رفتہ" کے ساتھ ہی چھپنا چاہیے۔

"ارمغانِ حجاز" علامہ کا آخری واحد مجموعہ ہے، جو اُن کے انتقال کے بعد طبع ہوا۔ اگر علامہ کی زندگی میں یہ مصرعہ غلط چھپ جاتا تو وہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ضرور فرما دیتے۔ چودھری محمد حسین جو ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے حقوق و اشاعت کی نگرانی کرتے تھے، اُن کو بھی اس غلطی کا احساس "ارمغانِ حجاز" کے ایک دو نہیں، چھ ایڈیشن چھپنے کے بعد ہُوا اور ساتویں ایڈیشن میں اس مصرعے کی تصحیح کر دی گئی۔

اس وضاحت کے بعد مذکورہ قطعے کے متعلق غلط فہمی باقی نہیں رہنی چاہیے۔

امتیازی کامیابیوں کے اعزاز اور تمغے

۱۸۹۳ء میں علامہ کو اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ سے یہ تمغہ اور وظیفہ ملا۔
اسی سال انھوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت
سے پاس کیا تھا۔





پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۹۹ء میں نمایاں اعزاز کے ساتھ فلسفے میں ایم اے
پاس کرنے کا تمغہ۔ علامہ پنجاب بھر میں اوّل آئے تھے۔









عربی میں امتیازی حیثیت سے ایم اے یا بی۔ اے پاس کرنے کا یہ تمغہ مؤلفِ "روزگارِ فقیر" کے بزرگ خان بہادر فقیر سید جمال الدین مرحوم نے اب سے کوئی ۷۳ سال قبل وقف کیا اور پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے منظور شدہ ریزولیشن مورخہ ۸ جون ۱۸۹۱ء کے مطابق یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ جس کی تصدیق مؤلف کے نام پنجاب یونیورسٹی کے خط نمبر ۸، A — ۸۶۲۵ مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء سے ہوتی ہے۔

فقیر سید جمال الدین مرحوم بڑی صفات کے مالک تھے۔ صاحبِ علم اور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ انتقال سے قبل ایک بڑا ذاتی کتب خانہ پنجاب پبلک لائبریری کو دیا تھا۔ علامہ کے لیے اُن کا یہ انعامی تمغہ اس حسنِ اتفاق کی یاد تازہ کر رہا ہے کہ علامہ اقبال کو فقیر خاندان کی تین پشتوں سے جو تعلقِ خاطر رہا، مشیتِ ایزدی اس کی بنیاد ۱۸۹۷ء میں ہی رکھ چکی تھی۔

اقبالؔ اور گرامیؔ

مولینا گرامی فارسی شاعری میں اپنے وقت کے خیامؔ اور نظیریؔ تھے۔ اُن کا اصل نام غلام قادر تھا اور وطن ہوشیار پور (مشرقی پنجاب)۔ علامہ اقبال سے اُن کے مراسم آخر دم تک بہت زیادہ خوشگوار رہے۔ وہ جب کبھی لاہور آتے، علامہؒ کے مکان پر قیام فرماتے۔ آپس میں کسی طرح کی معاصرانہ چشمک نہیں۔ اِنتہائی اخلاص و مودت کے تعلقات و روابط۔ انارکلی والے مکان میں انھیں اکثر علامہ کے ہاں فروکش دیکھا گیا۔ علامہ اور مولینا گرامی کے متعلق ایک شعر اُن کی وفات پر بہت مشہور ہُوا اور مَیں نے جب اسے سنا، اُسی وقت یاد ہوگیا اور اب تک یاد ہے، بلکہ حرزِ جان ہے:

صبا! بہ حضرتِ اقبال ایں پیام دِہ
کہ رفت جانِ گرامی و تو ہنوز خموش!

مولینا گرامی درویش صفت اِنسان تھے۔ وُہ جب لاہور تشریف لاتے تو علامہ کی قیام گاہ پر علم و فکر کی محفلیں خوب گرم رہتیں۔ اُنھیں فارسی زبان و ادب پر بڑا عبور تھا۔

میرے دوست راحت بخاری صاحب جو لاہور کے رہنے والے ہیں اور گزشتہ ۱۹ سال اقوامِ متحدہ کے مختلف شعبوں میں فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اب پاکستان واپس آچکے ہیں، اُنھوں نے یہ واقعہ سُنایا

کر میں ڈاکٹر تاثیر اور ایک دُوسرے ہم سن نوجوان کے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں بڑی عقیدت کے ساتھ حاضر ہُوا کرتا تھا۔ ایک روز ہم چند دوست میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر پہنچے تو علامہ گھر کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ باہر چند مُلاقاتی بیٹھے ہُوئے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب نے علامہ اقبال اور مولانا گرامی کے تعلقات و روابط کا ذکر چھیڑ دیا اور دورانِ گفتگو میں کہا کہ مولینا گرامی نے اقبال کے متعلق یہ اشعار کہے ہیں:

درسِ ماضی از کتابِ حال گیر — ساغر از خُم خانۂ اقبال گیر
حضرتِ اقبال آں دانائے نظر — دارد از بُود و نبُودِ ما خبر!
ما بہ ذوقِ سوختن کم ساختیم! — بیخودی را از خودی نشناختیم
آں نوا پردازِ اسرارِ ازل — شہسوارِ عرصۂ علم و عمل!
بیخودی را در خودی منزل شناس — در غبارِ کارواں محمل شناس
از نوایش بزمِ یورپ در خروش — حکمتِ امریکہ او را حلقہ گوش
نالہائے آتشینِ آں حکیم — سوخت رختِ فتنۂ اُمّید و بیم

ساخت با دو لہا و بودش ہیچ نیست
سوخت دل ہا و دُودش ہیچ نیست (گرامی)

علامہ کے متعلق مولینا گرامی کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہُوا ہے:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت!

فیضِ تربیت

علامہ کی ذات میں علم و عرفاں اور فکر و عمل کی اتنی بہت سی خوبیوں کا جمع ہو جانا محض حسنِ اتفاق نہ سمجھنا چاہیے۔ صالح اور متقی والدین کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ذہین و شفیق اُستاد کی نظرِ خاص کو اُن کے اِس اعلیٰ کردار کی تخلیق میں بہت دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اور جب علامہ کے ذاتی حالات کا ذکر چھڑتا ہے، ان بزرگوں کا تذکرہ بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ علامہ کی والدۂ محترمہ کے انتقال پر لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے جو اشعار کہے تھے، اُن میں اس حقیقت کا اظہار نہایت دلکش انداز میں کیا گیا تھا۔ علامہ اقبال اور اکبر الٰہ آبادی کے درمیان جو مخلصانہ مراسم آخر وقت تک قائم رہے، اُن پر جلد اوّل میں روشنی ڈالی جا چکی ہے لیکن حسبِ ذیل اشعار سے ان دونوں ہم عصر اور ہم فکر دانشوروں کے قلبی تعلق کا اور زیادہ اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرتِ اقبالؔ میں جو خُوبیاں پیدا ہُوئیں
قوم کی نظریں جو اُن کے طرز کی شیدا ہُوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت
یہ طریقِ دوستی، خودداریٔ باتمکنت!
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخُدا تھے، اہلِ دل تھے، صاحبِ اسرار تھے

جلوہ گر اُن میں اُنھیں کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت!
مادرِ مرحومۂ اقبال جنت کو گئیں!
چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہ گیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے
سالِ رحلت کا یہاں منظور اُسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات
رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہے تاریخِ وفات

۱۳۳۲ھ

ڈاکٹر تاثیر مرحوم

علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مرحوم سے راقم الحروف کو جو دیرینہ تعلقِ خاطر تھا، اُس کا اظہار جلد اول میں کر چکا ہوں۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ غیر ملکی لڑکیوں سے شادی کرنے کے بارے میں علامہ نے اُنھیں کیا مشورہ دیا تھا۔ جلد دوم کی ترتیب و تکمیل کے دوران محترمہ بیگم تاثیر نے کچھ واقعات قلمبند کرائے ہیں، جن سے جلد اول میں پیش کیے ہُوئے واقعے کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے اور علامہ مرحوم کی دوستانہ وضعداری اور خلوص و محبت کے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

یہ واقعات خود بیگم تاثیر کی زبانی سنیے :۔

"میرے شوہر تاثیر مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ جب میں ایف۔سی کالج لاہور میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ اُسی زمانے میں علامہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کے بعد پھر تو یہ مشغلہ ہو گیا کہ روزانہ شام اُن ہی کے ساتھ گزرتی۔ بہت سے دوست اور بزرگ جمع ہو جاتے اور مختلف مسائل پر گفتگو کا سلسلہ چلتا رہتا۔ شعر و ادب سے میرا شغف ان دنوں بہت بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان جانے کا مجھے مشورہ دیا اور میں نے اس مشورے پر عمل کیا۔"

بیگم تاثیر فرماتی ہیں کہ تاثیر مرحوم پہلے ہندوستانی تھے، جنھوں نے انگریزی

ادب میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ڈاکٹر اقبال نے میرے شوہر سے یہ بھی کہا تھا کہ تاثیر! تمھیں اگر ہندوستانی لڑکی پسند نہیں ہے اور تم غیر ملکی لڑکی ہی سے شادی کرنے پر تلے ہوئے ہو تو پھر جرمن لڑکی زیادہ بہتر ہوگی۔ جب تاثیر انگلستان سے واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے اُن سے دریافت کیا :

"میاں تاثیر! تمھاری جرمن بیوی کہاں ہے ؟"

تاثیر مرحوم نے جواب دیا" ڈاکٹر صاحب! میں نے جرمن لڑکی کی بجائے انگلش لڑکی پسند کی ہے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا" خیر، دُوسرے نمبر پر یہی بہتر ہے"۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے میں اتنی دلچسپی لی کہ اسلامی طریقے پر شادی کے لیے دوسرے وکلاء کے ساتھ کاغذات مرتب کیے اور خود ہی نکاح کا دن اور وقت مقرر کیا۔ ڈاکٹر صاحب علالت کے سبب چل پھر نہ سکتے تھے، لیکن وقتِ مقررہ پر علالت اور نقاہت کے باوجود بکمال شفقت ہماری قیامگاہ پر تشریف لائے۔ اُنھوں نے مجھ سے پہلے کلمۂ طیبہ پڑھوایا اور جب میں باقاعدہ مسلمان ہوگئی تو پھر خود نکاح پڑھایا۔ اس تقریب کو علامہ اقبال کی شرکت کی برکت حاصل تھی۔ شادی کے چند دن بعد میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں گئی تو وہاں اہلِ علم حضرات کا مجمع تھا۔ میں اُن سے مل کر چلی آئی۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء کے جاڑوں میں اپنی پہلی نومولود بچی کو لے کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور وہ حسبِ معمول بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اُن کی بزرگانہ شفقت کا

آج بھی تصور کرتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز مجھے سہارا دے رہی ہے۔"

بیگم ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے اس بیان میں نکاح کی جس قانونی دستاویز کا ذکر آیا ہے، اس کی حیثیت اقرار نامہ قبل از نکاح کی ہے اور اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس دستاویز کا اصل مضمون خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا اور پھر اُس پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے۔

نکاح نامہ کی اس دستاویز کا عکس بیگم تاثیر کے پاس محفوظ شدہ اصل کاپی سے حاصل کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں ازدواجی تعلقات اور میاں بیوی کے حقوق کا مرکز، مرجع اور حرفِ آخر اسلامی قانون کو قرار دیا گیا ہے۔

نکاح نامہ

علامہ کے مرتب کردہ اقرار نامہ قبل از نکاح کا عکس اس سے اگلے صفحے پر شائع کر دیا گیا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے اس معاہدے کا اردو مفہوم ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے ۔۔۔۔

"معاہدہ محررہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء مابین محمد دین تاثیر ساکن لاہور (ہونے والا شوہر) فریقِ اول و کرسٹابل جارج ساکن لندن (ہونے والی زوجہ) فریقِ ثانی - ہرگاہ کہ مذکورہ بالا محمد دین تاثیر اور کرسٹابل جارج عنقریب سلسلۂ مناکحت میں

منسلک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اور معاہدۂ نکاح کے سلسلے میں مابین فریقین یہ قرار پایا تھا کہ شرائط مندرجہ ذیل پر مشتمل ایک اقرارنامہ باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ لہٰذا دستاویز ہٰذا حسبِ ذیل شرائط کی سند کے طور پر تحریر کی جاتی ہے:

۱۔ بربنائے معاہدہ متذکرہ بالا اور نکاح مجوزہ محمد دین تاثیر مذکور اور کرسٹابل جارج مذکورہ برضامندی اقرار کرتے ہیں کہ چونکہ ہر دو فریق اقرارنامۂ ہٰذا مسلم ہیں، لہٰذا مجوزہ نکاح اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔

۲۔ بربنائے اقرار متذکرہ بالا اور نکاح مجوزہ محمد دین تاثیر مذکور اقرار کرتا ہے کہ جب تک اُس کا نکاح کرسٹابل جارج مذکورہ سے قائم رہے گا، وہ کسی بھی مذہب کی عورت کے ساتھ نکاحِ ثانی نہیں کرے گا۔ (یعنی فریقین کی شادی Monogamous ہوگی۔)

۳۔ بربنائے اقرار متذکرہ بالا اور نکاح مجوزہ محمد دین تاثیر مذکور شرع اسلامی کے تحت اپنا حقِ طلاق کرسٹابل جارج مذکورہ کو تفویض کرتا ہے۔

۴۔ زرِ مہر جو نکاح ہونے پر کرسٹابل جارج مذکورہ محمد دین تاثیر مذکور سے اِس اقرارنامے اور شرع اسلامی کے تحت

AGREEMENT

This agreement made the [illegible] day of October 19[illegible] between Mohammad Din Taseer of Lahore (the intended husband) of the first part, and Christabel George of London (the intended wife) of the second part; whereas a marriage is shortly intended to be solemnized between the said Mohd. Din Taseer and Christabel George, and upon the treaty of the said marriage it was agreed that the agreement hereinafter appearing should be duly executed; now this deed witnesseth as follows:

1. In pursuance of the said agreement and in consideration of the said marriage, the said Mohammad Din Taseer with the approbation of the said Christabel George agrees that the parties to this agreement being Muslims shall contract the intended marriage in accordance with Muslim Shariat.

2. In pursuance of the said agreement and in consideration of the said marriage, the said Mohammad Din Taseer agrees that during the continuance of his marriage with the said Christabel George the said Mohammad Din Taseer shall not contract any other marriage with any other woman of [illegible] persuasion, [illegible] the said marriage will be [illegible].

3. In pursuance of the said agreement and in consideration of the said marriage the said Mohammad Din Taseer agrees to delegate his right of divorce under Muslim Law, the said Christabel George.

4. That the dower (Mehr) claimable by Christabel George from Mohammad Din Taseer under this contract and under Muslim Law upon the determination of the marriage shall be Rs. [illegible] thousand.

In witness whereof the said Mohammad Din Taseer has hereto set his hand at Lahore this [illegible]th day of October 19[illegible].

Second above written.

Christabel George

[illegible]

Witness No.1.

Witness No.2. [illegible]

Witness No.3. [illegible]

First above written.

Mohammad Din Taseer

معاہدہ قبل از نکاح مابین ڈاکٹر تاثیر و بیگم تاثیر

طلب کر سکے گی، چھ ہزار روپیہ ہو گا۔

شرائطِ مندرجہ بالا کی منظوری کے ثبوت میں محمد دین تاثیر مذکور نے بمقام لاہور مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو دستاویز ہٰذا پر دستخط ثبت کیے۔ (دستخط فریقین اور گواہان)

عشقِ رسولؐ

علامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے عشق تھا، سچا اور والہانہ عشق! اس لیے وہ عاشقانِ رسولؐ کے دل و جان سے مداح اور قدرشناس تھے۔ سرکارِ دو عالم کی شانِ اقدس میں گستاخانہ کتاب شائع کرنے والے شخص راجپال کو لاہور کے ایک غیرت مند نوجوان غازی علم الدین نے کیفرِ کردار کو پہنچایا کر جب عدالتِ عالیہ سے سزائے موت پائی، تو اس سارے واقعے کے متعلق علامہ اقبال کے تاثرات بالکل واضح تھے۔ "روزگارِ فقیر" کی پہلی جلد میں یہ تمام تفصیل شائع ہو چکی ہے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے علامہ مرحوم کے جو ملفوظات محفوظ کیے ہیں، اُن میں علامہ مرحوم کا کہا ہوا یہ فقرہ بھی تھا، جسے غازی علم الدین کی شہادت کے زمانے میں علامہ کی زبان سے بار بار سنا گیا: "اسی گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔" (ہم باتیں ہی بناتے رہے اور نجار کا لڑکا بازی لے گیا)

عجیب اتفاق ہے کہ اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہے جسے بجا طور پر

لہ غازی علم الدین کے والد کا پیشہ نجاری تھا۔

داستانِ عشقِ رسولؐ کا گم شدہ ورق کہا جا سکتا ہے۔ اس واقعے کے کئی پہلو ہیں ـــــ کہ اہانتِ رسولؐ کی ناپاک جسارت کرنے والے کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اور ہونا چاہیے؟ ـــــ غیرت مند مسلمان عظمت و ناموسِ رسولؐ کے معاملے میں کس قدر حساس، سرفروش اور جاں نثار ہوتے ہیں؟ اور یہ کہ علامہ اقبال اپنے تمام فلسفیانہ افکار اور عقلیت کے باوجود ایسے موقعوں پر جذبۂ عشقِ رسولؐ کا اظہار واضح طور پر کرتے تھے۔

میرے دوست حبیبؒ احمد صاحب انصاری جو سرکاری ملازمت کے سلسلے میں بمبئی میں میرے رفیق رہے اور بعد میں سنٹرل ریونیو بورڈ پاکستان میں فسر دار افسر تھے، "روزگارِ فقیر" کے نقشِ اول خصوصاً غازی علم الدین کے واقعے سے بہت متاثر ہوئے اور توجہ دلائی کہ اقبال جیسے عاشقِ رسولؐ کے تذکرے میں غازی علم الدین کا واقعہ تو شامل ہے مگر کراچی کے غازی عبدالقیوم کی غیرتِ ایمانی اور ذکرِ شہادت سے یہ تذکرہ خالی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کے کلام میں بھی اُس کا ذکر موجود ہے۔ انصاری صاحب کے علاوہ دو اور ثقہ راویوں جناب عبدالخالق (ممبر میونسپل کارپوریشن کراچی) اور سید محمد اسلم بار ایٹ لاء (سابق اٹارنی جنرل رائل ایئر فورس) نے اس واقعے کی تصدیق کی۔ یہ دونوں حضرات مسلمانانِ کراچی کی دینی اور سماجی تحریکوں میں ہمیشہ سرگرم حصّہ لیتے رہے ہیں۔

لـــہ حبیب انصاری صاحب کو "روزگارِ فقیر" کی جلد دوم کی ترتیب و اشاعت سے بھی دلچسپی تھی لیکن کتاب کی اشاعت سے صرف پانچ ماہ قبل اگست ۱۹۶۳ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ خدائے بزرگ و برتر سے دُعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

یہ ۱۹۳۴ء کے اوائل کا ذکر ہے۔ جب سندھ صوبہ بمبئی میں شامل تھا' اُن دنوں آریہ سماج حیدرآباد (سندھ) کے سیکریٹری نتھورام نے "ہسٹری آف اسلام" کے نام کی ایک کتاب شائع کی' جس میں آقائے دوجہاں سرکارِ دوعالم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شانِ اقدس میں سخت دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا گیا۔ مسلمانوں میں اس کتاب کی اشاعت کے سبب بڑا اضطراب پیدا ہوا' جس سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت نے کتاب کو ضبط کیا اور نتھورام پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا' جہاں اُس پر معمولی سا جرمانہ ہوا اور ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔

عدل وانصاف کی اس نرمی نے نتھورام کا حوصلہ بڑھا دیا اور اُس نے وی۔ ایم فیرس جوڈیشل کمشنر کے یہاں ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ کمشنر کی عدالت نے اس گندہ دہن شاتمِ رسولؐ کی ضمانت منظور کر لی۔ اس سے مسلمانوں کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور فکرمند تھے کہ توہینِ رسولؐ کے اِس فتنے کا سدِّباب آخر کس طرح کیا جائے۔

ہزارے کا رہنے والا عبدالقیوم نام کا ایک نوجوان تھا جو کراچی میں وکٹوریہ گاڑی چلاتا تھا۔ جونا مارکیٹ کی کسی مسجد میں اُس نے اِس واقعے کی تفصیل سنی اور یہ معلوم کر کے کہ ایک ہندو نے حضور سرورِ کائنات کی توہین کی ہے اُس کے غم واضطراب اور اندوہ وملال کی کوئی حد نہ رہی۔

ستمبر ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے کہ مقدمۂ اہانتِ رسولؐ کے ملزم نتھورام کی اپیل کراچی کی عدالت میں سنی جا رہی تھی۔ عدالت دو انگریز ججوں کی بنچ پر مشتمل

تھی ۔ عدالت کا کمرہ وکیلوں اور شہریوں سے بھرا ہوا تھا ۔ غازی عبدالقیوم نہایت اطمینان کے ساتھ دوسرے تماشائیوں کے ساتھ وکلاء کی قطار کے پیچھے نتھورام کی برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ عین مقدمے کی سماعت کے دوران وہ اپنا تیز دھار کا چاقو لے کر نتھورام پر ٹوٹ پڑا اور اس کی گردن پر دو بھرپور وار کیے ۔ نتھورام چاقو کے زخم کھا کر زور سے چیخا اور زمین پر لڑکھڑا کر گر پڑا ۔ غازی عبدالقیوم نے پولیس کی گرفت سے بچنے اور فرار ہونے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی ۔ اس نے نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ۔ انگریز جج نے ڈائس سے اتر کر اس سے پوچھا ۔۔۔ ”تم نے اس شخص کو کیوں قتل کیا ؟“

غازی عبدالقیوم نے عدالت میں آویزاں جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ تصویر تمہارے بادشاہ کی ہے ۔ کیا تم اپنے بادشاہ کی توہین کرنے والے کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دو گے ۔۔۔ ؟ اس ہندو نے میرے آقا اور شہنشاہ کی شان میں گستاخی کی ہے ، جسے میری غیرت برداشت نہ کر سکی ۔

غازی عبدالقیوم پر مقدمہ چلا ۔ اس نے اقبال جرم کیا ۔ آخرکار سیشن جج نے سزائے موت کا حکم سنایا ۔ غازی عبدالقیوم نے فیصلہ سن کر کہا ۔۔۔

> ”جج صاحب ! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی ۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے ، اگر میرے پاس لاکھ جانیں بھی ہوتیں تو ناموسِ رسول پر نچھاور کر دیتا ۔“

اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔ دیندار مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ غازی عبدالقیوم کا قانونی دفاع کرنے کے لیے سامنے آگیا۔ سید محمد اسلم بار ایٹ لاء کو عبدالقیوم کی پیروی کی سعادت حاصل ہوئی لیکن اس مرد مجاہد (عبدالقیوم) نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے قانونی مشیر پر واضح کر دیا کہ میں نے ماتحت عدالت میں جو اقبالی بیان دیا ہے' اس کے خلاف کچھ کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گا۔

سید محمد اسلم نے مقدمے کی تیاری جاری رکھی اور شہادتوں کے سلسلے میں علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے ملک کے ممتاز علماء کو بطور گواہ طلب کرانے کی درخواست کی تاکہ وہ اسلامی نقطۂ نظر واضح کر سکیں' لیکن عدالت نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ مقدمۂ صفائی کی ساری بنیاد اس نکتے پر رکھی گئی تھی کہ

> "یہ ایک مسلمان کا ایمان و عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص ناموسِ رسولؐ پر حملہ کرے تو وہ اُسے موت کے گھاٹ اتار دے۔"

اپیل کی سماعت جسٹس دادیبا مہتہ (Dadiba Mehta) اور 9 ارکانِ جیوری کے سامنے شروع ہوئی۔ جیوری چھ انگریزوں' دو پارسیوں اور ایک گوانی عیسائی ممبر پر مشتمل تھی۔ عدالت کے باہر کم و بیش ۲۵ ہزار مسلمانوں کا ایک بڑا ہجوم فیصلے کا منتظر تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کے دلائل کے بعد غازی

عبدالقیوم کے پیروکار سید محمد اسلم نے صفائی کا موقف پیش کیا۔ انھوں نے مقدمے کے بنیادی نکات اور اقدامِ قتل کے محرکات پر تین گھنٹے تک مدلل بحث کی۔ اُن کی تقریر کے بعض حصے اس قدر اہم تھے کہ انھیں قانون و انصاف کی تاریخ میں ہمیشہ زریں حروف میں لکھا جائے گا۔

انھوں نے "اشتعال" کے قانونی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش کیا —

"سوال یہ نہیں ہے کہ عبدالقیوم کا اقدام ملک کے قانون کے خلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ عبدالقیوم نے یہ اقدام انتہائی اشتعال کے عالم میں کیا ہے تو کیوں نہ اُسے وہ کم سے کم سزا دی جائے' جس کی اجازت دفعہ ۳۰۲ کے تحت قانون نے دے رکھی ہے۔ اگر موجودہ قانون زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے' یا کسی عورت کے معاملے میں قاتل کو "اشتعال" کی رعایت دیتا ہے تو رعایت کا یہ اصول عبدالقیوم کے مقدمے میں کیوں قابلِ قبول نہیں ہے جبکہ ایک مسلمان کے لیے ناموسِ رسولؐ پر حملے سے زیادہ اور کوئی اشتعال انگیزی نہیں ہوسکتی۔"

وکیلِ صفائی کی تقریر کے دوران میں جج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ کیا آپ کے اس اظہارِ خیال سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ نہیں ہوگا؟

سید محمد اسلم نے اس موقع پر جواب دیا :

"جناب والا! مسلمان حکومت اور ہندو اکثریت کو یہ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے ہیں کہ ان کے لیے رسول اللہ کی محبت کیا حیثیت رکھتی ہے اور اس بارے میں مسلمانوں کے جذبات کیا ہیں۔ مگر ان دونوں نے ذرا توجہ نہیں دی۔ اب مجھے عدالت میں یہ واضح کرنے کا موقع مل رہا ہے کہ جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے، وہ ناموس رسالت کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز اور قوت کو ختم کر کے رہے گا۔ اس معاملے میں مسلمان کو تعزیراتِ ہند کی پروا ہے، نہ پھانسی کے پھندے کی۔"

غازی عبدالقیوم کے پیروکار سید محمد اسلم نے اقدام قتل کے لیے اشتعال کے مفہوم کی اہمیت پر جو قانونی نکتہ پیش کیا تھا، اگر وہ تسلیم کر لیا جاتا تو ناموسِ رسالت پر حملہ کرنے کی مذموم تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی اور آئندہ کوئی اس جسارت کا تصور بھی نہ کر سکتا۔ لیکن عدالتِ عالیہ نے یہ اپیل خارج کر دی۔ غازی عبدالقیوم کے لیے سزائے موت بحال رہی۔ پُرجوش اور مضطرب مسلمانوں کے لیے یہ وقت بڑی آزمائش کا تھا۔ بالآخر فروری ۱۹۳۶ء میں کراچی کے مسلمانوں کا ایک وفد حکیم الامت علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ وفد جس میں مولوی ثناء اللہ، عبدالخالق اور حاجی

عبدالعزیز شامل تھے، لاہور پہنچا اور میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مقدمے کی روداد تفصیل کے ساتھ سنائی ـــــ اس کے بعد عرض کیا کہ آپ وائسرائے سے ملاقات کریں۔ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں اور انھیں اس پر آمادہ کریں کہ غازی عبدالقیوم کی سزائے موت عمر قید سے بدل دی جائے۔ وفد نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ نے سعی و توجہ فرمائی تو پوری توقع ہے کہ غازی عبدالقیوم کی جانب سے رحم کی اپیل حکومتِ ہند ضرور منظور کرے گی۔"

علامہ وفد کی یہ گفتگو سن کر دس بارہ منٹ تک بالکل خاموش رہے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وفد کے ارکان منتظر اور مضطرب تھے کہ دیکھیے، علامہ کیا فرماتے ہیں۔ توقع یہی تھی کہ جواب اثبات میں ملے گا کہ ایک عاشقِ رسولؐ کا معاملہ دوسرے عاشقِ رسولؐ کے سامنے پیش ہے ـــــ اس سکوت کو پھر علامہ اقبال ہی کی آواز نے توڑا۔ انھوں نے فرمایا:

"کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟"

ارکانِ وفد نے کہا "نہیں، اس نے تو ہر عدالت میں اپنے اقدام کا اقبال اور اعتراف کیا ہے۔ اس نے نہ تو بیان تبدیل کیا اور نہ لاگ لپیٹ اور ایچ پیچ کی کوئی بات کہی۔ وہ تو کھلے خزانے کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے۔ مجھے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی کوشش مت کرو!

وفد کی اس گفتگو کو سن کر علامہ کا چہرہ تمتما گیا۔ انھوں نے برہمی کے

لہجے میں فرمایا ـــــ

"جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے،
تو میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں؟
کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کے لیے وائسرائے کی
خوشامد کروں، جو زندہ رہا تو غازی ہے اور مرگیا تو شہید
ہے ـــ!"

علامہ کے لہجے میں اس قدر تیزی اور سختی تھی کہ وفد کے ارکان اس سلسلے میں پھر کچھ اور کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ وفد کراچی واپس ہو گیا۔

غازی عبدالقیوم کو جس دن پھانسی دی گئی ہے، کراچی کی تاریخ میں وہ دن مسلمانوں کے جوش و اضطراب کا یادگار دن تھا۔ دلوں میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ کاش، یہ شہادت ہمیں میسر آتی ـــ!

لاہور میں غازی علم الدین اور کراچی میں غازی عبدالقیوم کے ان واقعات کا علامہ اقبال نے بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا اور اپنے اس قلبی تاثر کو تین شعروں میں بیان فرما دیا تھا۔ یہ اشعار "لاہور اور کراچی" کے عنوان سے "ضرب کلیم" میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر غازی عبدالقیوم کے لیے رحم کی درخواست کے اس واقعے کی روشنی میں ان اشعار کا مفہوم کچھ اور زیادہ ابھرتا ہے۔

لاہور اور کراچی

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر
ان شہیدوں کی دیت[1] اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں، تجھے کیا یاد نہیں؟
حرفِ "لاتدع مع اللہ الٰھاً آخر"[2]

علامہ اقبال کے ان اشعار میں کس قدر عزیمت اور استقامت پائی جاتی ہے۔ تیسرے شعر میں توحید خالص کو کتنے دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان اشعار سے اس کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس قسم کے واردات و معاملات میں علامہ کا انداز فکر کیا تھا۔ لاہور اور کراچی میں عشقِ رسول کی ان زریں مثالوں کے لیے یہ اشعار زندۂ جاوید خراجِ عقیدت ہیں۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

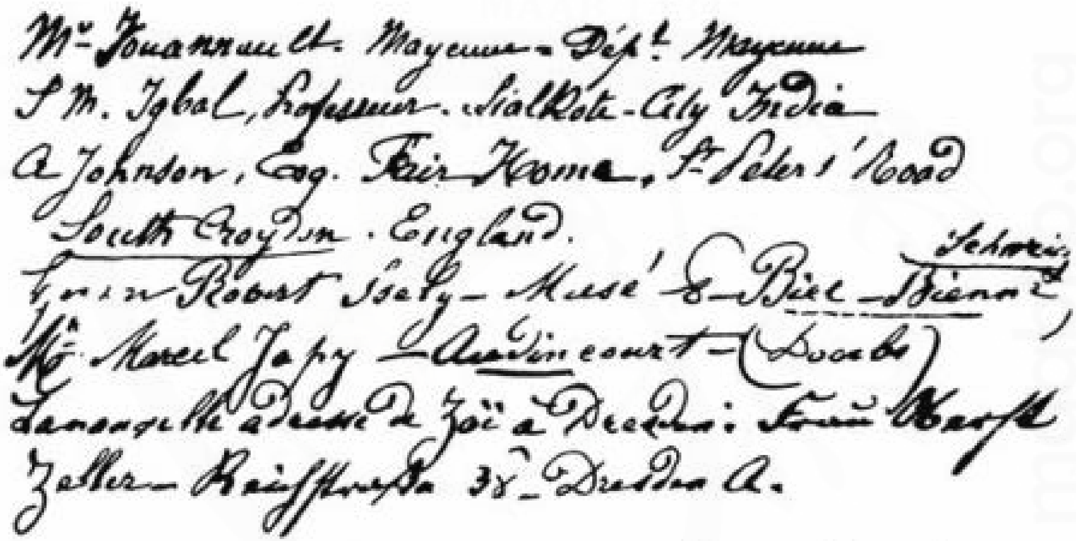
---

[1] دیت: خوں بہا اور جسمانی ضرر پہنچانے پر تاوان۔

[2] لاتدع مع اللہ الٰھاً آخر: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو مدد اور عبادت کے لیے مت پکار۔



ہائیڈل برگ جرمنی کے اس مکان کی تصویر، جہاں پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی تکمیل کے دوران علامہ کا قیام رہا۔


Mr. Jouannault. Mayenne. Dépt. Mayenne
S. M. Iqbal, Professor. Sialkote-City India
A. Johnson, Esq. Fair Home, St. Peter's Road
South Croydon. England.
Frau Robert Isely – Mesé 8 – Biel – Bienne (Schweiz)
Mr. Marcel Japy – Audincourt – (Doubs)
[illegible] adresse à [illegible] à Dresden: Frau Marga
Zeller – Reichsstraße 38 – Dresden A.

اس اندراج کا عکس جو ہائیڈل برگ کے مکان کی مالکہ نے علامہ کے قیام کے متعلق اپنے رجسٹر میں کر رکھا تھا۔

دیباچۂ اسرارِ خودی

علامہ اقبال کے فارسی کلام کی پہلی کتاب ۱۹۱۵ء میں "مثنوی اسرارِ خودی" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہی وہ شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس میں علامہ نے پہلی بار فلسفۂ خودی کو پیش کیا اور انگلستان میں جب اس کا ترجمہ شائع ہوا تو علامہ نہ صرف یورپ بلکہ دنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔ یورپ کے علماء نے اس کے متعلق رائے ظاہر کی کہ یہ "مثنوی ایک زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمد ﷺ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے۔"

"مثنوی اسرارِ خودی" کا سب سے پہلا ایڈیشن چھوٹی تقطیع کے ۱۵۶ صفحات پر آج سے نصف صدی قبل صرف پانچ سو کی تعداد میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی تھا۔ علامہ نے اس ایڈیشن کا جو نسخہ اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں سیالکوٹ بھیجا تھا، وہ اس وقت راقم الحروف کے سامنے ہے۔ اس نسخے میں بارہ صفحات کا وہ دیباچہ بھی شامل ہے جو علامہ نے خود لکھا اور جس میں

تجزیہ کرکے بتایا کہ فلسفۂ خودی کی تخلیق و تجدید کے کیا اسباب و محرکات ہیں، اور مختلف اُدوار میں انسانی اِدراک و محسوسات میں کیا تغیّر و تبدّل رُونما ہوئے ہیں۔

جس طرح افلاطون سے "اعیان" اور ڈیکارٹ سے "تشکیک کا فلسفہ" منسوب ہے، اسی طرح علامہ اقبال فلسفۂ خودی کے سبب آفاق گیر شہرت رکھتے ہیں اور آئے دن اُن کے افکار پر بحث و مذاکرہ ہوتا رہتا ہے۔ علامہ مرحوم نے مثنوی "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ دراصل اِس بحث کا مرکزی موضوع ہیں ــــ لیکن راقم الحروف نے تحقیق کی ہے کہ مثنوی "اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن کے بعد اِس دیباچے کو کتاب میں نہیں چھاپا گیا۔ "اسرارِ خودی" کے پہلے دو ایڈیشن اب کمیاب ہی نہیں، بلکہ نایاب ہیں۔ دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ جناب ممتاز حسن کو اُن کے ایک دوست نے ۱۹۵۸ء میں اس موقعے پر پیش کیا تھا، جب وہ "یومِ اقبال" میں شرکت کی غرض سے تہران جا رہے تھے۔ نسخے کی پشت پر علامہ کے دستخط ثبت ہیں اور پیش لفظ میں اُنھوں نے حافظ شیرازی سے متعلق اشعار کے علاوہ دیباچے کی عدمِ اشاعت کا بھی ذکر آیا ہے۔

راقم الحروف کو اندیشہ ہے کہ علامہ کی نثری تحریر کا یہ شاہکار دیباچہ جو فلسفۂ خودی کی بنیادی تشریح کا حامل بھی ہے، رفتہ رفتہ ضائع نہ ہو جائے۔ اِس لیے پچاس سال کے بعد یہ دیباچہ من و عن اِس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ علامہ اقبال کے فلسفہ، پیام اور کلام پر تحقیق کریں گے، وہ اس دیباچے سے ضرور فائدہ اُٹھائیں گے۔

دیباچہ

"یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کے رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کے رُو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی، جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا، جس قدر کہ ان کی اُفتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں

زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی اَنا محض ایک فریبِ تخیّل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اُتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق اُن کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا، جس کے لیے اُن کی فطرت متقاضی تھی۔

ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے مُوشگاف حکماء نے قوّتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اَنا کی حیات کا یہ مشہود تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے عمل سے متعیّن ہوتا ہے' یا یُوں کہیے کہ انسانی اَنا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گزشتہ طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام کرتا رہے گا، وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیلِ یوحنا کی پہلی آیت میں لفظِ 'کلام' کی جگہ لفظِ 'عمل' پڑھتا ہے ("ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام ہی خدا تھا۔") تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتے کو دیکھتی ہے جس کو ہندو حکماء نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکماء نے تقدیر کی

مطلق العنانی اور انسانی حرّیت یا بالفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے اُن کی جدّت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جب اَنا کی تعیین عمل سے ہے تو اَنا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملّی پہلو سے نہایت خطرناک تھا اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو جو ترکِ عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے۔ بنی نوعِ انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلّی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضاء فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رام نوج بھی اسی راستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروسِ معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے، سری شنکر کے منطقی طلسم نے

اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی۔ مگر اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین ابنِ عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے جزو و کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" کا

اور شرارِ سنگ" میں جلوۂ طور" کا بلا واسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا، مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماج گاہ بنایا اور ان کی حسین وجمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علماء قوم میں سب سے پہلے غالباً ابنِ تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ مُلا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب "دبستانِ مذاہب" میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ابنِ تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا، مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دل رُبائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ شعراء میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقتِ حال سے آگاہ تھے، مگر باوجود اس بات کے ان کا

کلام شاہد ہے کہ وہ اپنے گردو پیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان حالات میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے عملی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا۔ مرزا بیدل علیہ الرحمتہ لذتِ سکون کے اس قدر دل دادہ ہیں کہ ان کو جنبشِ نگاہ تک گوارا نہیں۔

نزاکت ہاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را!

اور امیر مینائی مرحوم یہ تعلیم دیتے ہیں کہ

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا!

مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبیات و تخیلات اہلِ مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں۔ اگرچہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتداء ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظامِ وحدت الوجود سے ہوتی ہے، لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم، جس کو ریاضیات کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا، دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔

سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اِس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے، جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لیے مختلف حواس ہیں، اسی طرح اِنسانوں میں ایک اور حاسہ بھی ہے، جس کو "حِسِ واقعات" کہنا چاہیے۔ ہماری زندگی واقعاتِ گردوپیش کے مُشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اِس قوت سے کام لیتے ہیں، جس کو میں نے حِسِ واقعات کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے؟ نظامِ قدرت کے پُراسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، مگر بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعاتِ حاضرہ، جن کو نظریات کے دل دادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بنگاہِ حقارت دیکھتے ہیں، اپنے اندر حقایق و معارف کا ایک گنجِ گرانمایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا اِحسان تمام دُنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں "حِسِ واقعات" اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی "دماغ بافتہ" فلسفیانہ نظام، جو واقعاتِ متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو،

انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کریں۔

یہ ہے ایک مختصر خاکہ اس مسئلے کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع ہے۔ میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ اس دیباچے سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں محض ان لوگوں کو نشانِ راہ بتانا مقصود ہے جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دِقتوں سے آشنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سطورِ بالا سے کسی حد تک یہ مطلب نکل آئے گا۔

شاعرانہ پہلو سے اِس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت اِس کے اثبات استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔

ہاں لفظ "خودی" کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعیینِ ذات ہے۔ مرکب لفظ "بے خودی" میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے اور غالباً محسن تاثیر کے اِس شعر میں بھی لفظ خودی کے یہی معنی ہیں ؎

غریقِ قلزمِ وحدت دم از خودی نزند
بُرد محال کشیدن میانِ آب نفس!

محمد اقبال

"اسرارِ خودی" کا یہ دیباچہ علامہ اقبال کی فلسفیانہ بصیرت اور وُسعتِ مُطالعہ کی جیتی جاگتی شہادت ہے۔ وہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ ــــ "حکمت مومن کی کھوئی ہوئی متاع ہے۔ وہ جہاں بھی ملے، اُسے لے لو۔"

ـــ تو ـــ

اقبال نے افضل البشر نبیِ اُمّی، صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے اِرشاد کی تعمیل میں، جس سے بھی اور جہاں سے بھی "حکمت" ملی، حاصل کی، اور اُس کا اظہار بھی کر دیا کہ علمی دیانت کا یہی تقاضا ہے۔

"اسرارِ خودی" کے بارے میں مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن کو علامہ اقبال



۱۹۳۱ء میں علامہ مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے۔ قاہرہ کے مشہور اخبار "الاہرام" نے مسلمانوں کے اس عظیم الشان اجتماع کی تصویریں نمایاں طور پر شائع کیں۔ پہلی قطار میں دائیں طرف سے پہلے نمبر پر علامہ اقبال تشریف فرما ہیں۔

نے جو خط لکھا تھا، اُس کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:

"میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ مُسلمان صُوفیاء اور حُکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور زماں اور وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صُوفیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں انسان کے معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، پُوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات ہی کے مسائل سے ہے۔"

"عصرِ نو کا ایک مُسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو، جن کا مبدأ اور سرچشمہ قرآنِ کریم ہے، مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے، تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ یُوں کہنا چاہیے کہ قدیم حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا جا رہا ہے۔"

قرآن اور اقبال از ابو مصلح، ادارۂ عالمگیر
تحریکِ قرآنِ مجید حیدرآباد دکن، صفحہ ۴۲-۴۳

علامہ کے مکتوب کے اس شہ پارے سے یہ بات کھُل کر سامنے آتی ہے کہ بھارت کی ویدانت ہو یا ایران کی زروانیت، یونان کی اشراقیت اور

مشائیت ہو یا یورپ کے فلاسفہ کے افکار و نظریات ہوں، اقبال نے سب کا مطالعہ کیا ہے، مگر اسلامی اور قرآنی فکر ہر حال میں اور طلب و جستجو کی ہر وادی میں اُن کا مقصود، ماخذ اور سرچشمہ رہی ہے۔ ان کے ایمان و یقین کی یہی قوت تھی جو کسی دوسرے نظریے اور عقیدے سے مغلوب نہیں ہو سکی، یہاں تک کہ اُن کا ضمیر شاعری کی زبان میں پکار اُٹھا ـــ

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!

○

وصیت نامہ

علامہ اقبال نے اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کے تقرر کے بارے میں جو وصیت نامہ لکھا تھا، اُسے پڑھ کر حکمت و بصیرت کے بعض نکتوں کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان وصیت کرتے وقت ایمان و عقیدہ کے بنیادی اصول دوسرے امور اور مفادات پر کس طرح مقدم رکھتا ہے۔ ذیل میں اس وصیت نامے کے اقتباس پیش کیے جا رہے ہیں :-

وصیّت

"منکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کا ہوں۔ اِس وقت بہ ثباتیِ ہوش و حواسِ خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ چونکہ میری ہر دو اولاد نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور من مُقِر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی، اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولادِ مذکورہ نابالغ رہیں تو اُن کی جائداد و ذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے :

(۱) خواجہ عبدالغنی، ماموں حقیقی نابالغان۔

(۲) شیخ اعجاز احمد، سب جج، برادر زادہ من مُقِر۔

(۳) چودھری محمد حسین ایم۔اے، سپرنٹنڈنٹ، پریس برانچ، لاہور۔

(۴) منشی طاہر الدین، جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور اُن کی شرافت و دیانت پر مجھے پُورا اعتماد ہے۔

اِس وصیت کی رُو سے میں اِن مجملہ حضرات کو

نابالغان کی ذات و جائداد کا ولی مقرر کرتا ہوں۔ تمام امورِ متعلقہ ذات و جائدادِ نابالغان کا انتظام اولیاء مذکور کثرتِ رائے سے کیا کریں گے، لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات و جائداد کا ولی ہوگا اور اُس کی جائداد و ذات کے متعلقہ انتظام خود بطور ولی کرے گا۔ اگر ان اولیاء مقرر کردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے تو اس صورت میں باقی اولیاء کو اختیار ہوگا کہ کثرتِ رائے سے اس کا جانشین مقرر کرلیں۔ اگر کسی معاملے میں اولیائے مذکورہ کی رائے مساوی نہ ہو تو صدرِ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو، اُسی پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

اس وقت جو ملکیت کی چیزیں ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:۔

کتب فلسفہ و لٹریچر وغیرہ۔ ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے مع مسودات۔

مثنوی مولانا رُوم، فارسی و انگریزی، مرتبہ ڈاکٹر نکلسن۔
دیوان مرزا عبدالقادر بیدل قلمی۔ مثنوی مرآۃ معنوی
(مولانا رُوم، مطبوعہ حیدرآباد)۔ اپنے پڑھنے کا قرآن
شریف۔ باقی اور مسوّدات و کاغذات میں نے جاوید
کو بطور یادگار دے دیے ہیں۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی
وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج، لاہور کی لائبریری
میں رکھ دی جائیں۔

باقی میرا اسباب، مثلاً دو قالین بر رنگ سُرخ
و دری و صوفہ و کرسیاں بکس اور پہننے کے کپڑے ہیں۔
ان کی نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد
میرے پہننے کے تمام کپڑے غُرباء میں تقسیم
کر دیے جائیں۔

محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا، لاہور۔ بقلم خود
۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مکرّر آنکہ

اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائیداد
کے انتظام یا کسی اور جائیداد کی خرید وغیرہ

کے لیے اولیاء کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرتِ رائے سے بینک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں۔

دیگر میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائدِ دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں۔ بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے وُرثاء کا اور اولیاء مقررکردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پُورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔

محمد اقبال بیرسٹر
۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء

اس موقع پر یہ چند باتیں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔

علامہ نے یہ وصیت نامہ اپنے انتقال سے ڈھائی سال قبل لکھا ہے جب کہ اُن کی عمر اٹھاون سال اور کچھ مہینے کی تھی۔ اس سن و سال کے آدمی کو ہمارے معاشرے میں "بُوڑھا" نہیں سمجھا جاتا۔ بہت

سے لوگ جن کی بیویاں مرجاتی ہیں، اس عمر میں شادیاں کرتے ہیں —— علامہ اقبال کے آئینۂ ادراک کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر مجلا کر دیا تھا کہ اس پر بعض آنے والے واقعات منعکس ہو جاتے تھے۔ یہ وصیت نامہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ علامہ اقبال کو مرنے سے کئی سال قبل اُن کے حادثۂ رحلت کی جھلک شاید دکھا دی گئی تھی۔ یہ دلیل ہے اُن کی فراست و بصیرت اور صفائے قلب کی!

شعراء عام طور پر اپنے بیوی بچوں کے معاملات میں زیادہ ذمہ دار نہیں سمجھے جاتے، مگر علامہ کے وصیت نامے کے ان اقتباسات کا ایک ایک حرف اس کی گواہی دے رہا ہے کہ اقبال کو جاوید اور منیرہ سے بے حد لگاؤ اور بے پناہ محبت تھی اور شفقتِ پدری کی دولتِ فراواں اللہ تعالیٰ نے اُن کو عطا کی تھی۔

اس وصیت نامے کی زبان کتنی سادہ اور عام فہم ہے۔ کسی قانونی الجھن اور ذو معنویت کے لیے اس میں گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال فنِ قانون میں کتنی بصیرت رکھتے تھے اور ان کا ذہن کس قدر سلجھا ہوا اور حقیقت شناس تھا۔

مسلمان مختلف فقہی مذاہب کی پیروی کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے یہ فرما کر "میں عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا معتقد ہوں" شرعی اور قانونی طور پر اس کی وضاحت بھی کر دی کہ

اُن کے وصیت نامے متضمنات (Contents) پر عمل درآمد فقہِ حنفی کے مطابق ہو گا۔

تقلید اور عدمِ تقلید پر بڑی علمی بحثیں اسلامی لٹریچر میں ملتی ہیں۔ علامہ اقبال نے اس وصیت نامے میں جو یہ لکھا ہے ——

"میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے
فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں اور عملی اعتبار
سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں"۔

اس سے تقلید اور عدمِ تقلید کے بحث و نزاع پر بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے۔ اس معاملے میں علامہ کا مسلک حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی سے ملتا جلتا ہے۔ حق یہ ہے کہ عوام کے لیے تقلید ناگزیر ہے، مگر اہلِ علم اور اربابِ فکر و نظر کا معاملہ بالکل عوام جیسا نہیں ہے۔

اس وصیت نامے کا یہ جملہ ——

"میں سلف کا پیرو ہوں"۔

انتشارِ فکر اور تجدد و آزاد خیالی کے اس دور میں مشعلِ راہ ہے۔ عقاید و اعمال میں سلفِ صالحین ہی کی پیروی میں دین و ایمان کی سلامتی ہے۔ علامہ اقبال مجتہدانہ فکر و نظر رکھتے تھے۔ اُنھوں نے

مشرق و مغرب کے علوم کے بحرِ ذخار میں شناوری کی تھی، مگر اس کے باوجود سلفِ صالحین کی پیروی کے وہ قائل تھے اور یہ دلیل ہے اقبال کی پختگیِ ایمان اور سلامتیِ طبع کی۔

"بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثاء اور اولیاء مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم رکھیں۔"

وصیت نامے کے یہ اختتامی جملے ہیں۔ ان کے بعد علامہ اقبال کے دستخط ہیں۔ ان چند لفظوں میں علامہ نے وہ بات کہی ہے جو اخلاق و نصیحت کی ضخیم کتابوں کا نچوڑ اور لبِ لباب ہے۔ ان کی نگاہ میں دولت، ظاہری وجاہت، یہاں تک کہ علم بھی شرافت و دینداری کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اصل چیز شرافتِ نفس اور دینداری و تقویٰ ہے کہ ان خوبیوں پر آخرت کی نجات و فلاح کا دار و مدار ہے۔

○

حیاتِ اقبال کی اہم یادداشتیں

اس عنوان کے تحت "روزگارِ فقیر" کی جلد اول میں بہت سی اہم یادداشتیں جمع کی جا چکی ہیں۔ مزید اہم یادداشتیں جلد دوم میں شائع کی جا رہی ہیں :-

اسسٹنٹ پروفیسر	گورنمنٹ کالج لاہور میں	۱۹۰۳ء
پروفیسر شعبۂ عربی (قائم مقام پروفیسر آرنلڈ)	لندن یونیورسٹی	۱۹۰۷-۰۸ء
سفرِ مدراس	خطبات کے سلسلے میں	۱۹۲۸ء
سفرِ فلسطین	مؤتمرِ عالمِ اسلامی کی کانفرنس میں شرکت	۱۹۳۱ء
ڈاکٹر آف لٹریچر	پنجاب یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری دی	۴ دسمبر ۱۹۳۳ء

تصانیف

علامہ اقبال کی تصانیف کے متعلق ایک تعارفی مضمون "روزگارِ فقیر" کی جلد اوّل میں شائع ہو چکا ہے۔ جو حضرات علامہ کی زندگی یا علمی کارناموں پر تحقیق کا شوق رکھتے ہیں؛ ان کی سہولت کے لیے اس مضمون کو دو اور تصانیف کے حوالوں سے مکمل کیا جا رہا ہے:

(۱) **علم الاقتصاد** ۔ اردو زبان میں جدید معاشیات پر پہلی کتاب علامہ اقبال کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ علامہ اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ کتاب میں قومی معیشت، زمین، محنت، سرمایہ، مسئلہ قدر، منافع، اجرت، مالگزاری، لگان، سُود، آبادی اور تجارتِ بین الاقوام کے موضوعات پر نہایت مفید بحث کی گئی ہے۔ جناب ممتاز حسن کی کوشش سے ۱۹۶۱ء میں اسے دوبارہ کراچی سے شائع کیا گیا ہے۔

(۲) **تاریخِ ہند** ۔ اردو زبان میں تاریخ کی یہ کتاب ۱۴-۱۹۱۳ء میں مڈل کی جماعتوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کتاب کا خلاصہ امرتسر کے ایک پبلشر نے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا تھا، وہ محفوظ[1] ہے۔ اصل کتاب نایاب ہے۔

---

[1] جناب ممتاز حسن کی لائبریری میں محفوظ ہے

"روزگارِ فقیر" کی جلد اوّل میں حیاتِ اقبال کی جو اہم یادداشتیں شائع کی گئی ہیں، اُن میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کرنے کا سال مختلف کتابوں کے حوالوں سے ۱۹۰۸ء درج کیا گیا ہے ۔ حال ہی میں ڈاکٹر اطہر رشید اور جناب ممتاز حسن کے گراں قدر تعاون سے میونخ یونیورسٹی جرمنی سے اس ڈگری کا عکس حاصل ہوا ہے جو علامہ اقبال کو اپنا شہرۂ آفاق مقالہ "ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا" لکھنے پر ملی تھی ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ نے یہ ڈاکٹریٹ نومبر ۱۹۰۷ء میں کی ۔ اگرچہ "روزگارِ فقیر" کے اندراج میں صرف چھ ہفتے کا فرق ہے، لیکن اصل کاپی ملنے کے بعد اس اندراج کی تصحیح کی جا رہی ہے اور میونخ یونیورسٹی سے حاصل شدہ ڈگری کا یہ نادر عکس آئندہ صفحات پر شائع کیا جا رہا ہے ۔

(مؤلف)

FACULTATIS PHILOSOPHICAE SECT. I P. T. DECANUS ET PROMOTOR LEGITIME CONSTITUTUS

PRAECLARO ET PERDOCTO DOMINO

SHEIKH MUHAMMAD IQBAL

EX OPPIDO SIALKOT

EXAMINIBUS RIGOROSIS MAGNA CUM LAUDE SUPERATIS

DISSERTATIONE INAUGURALI SCRIPTA TYPISQUE MANDATA

„THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA"

DOCTORIS PHILOSOPHIAE GRADUM

CUM OMNIBUS PRIVILEGIIS ATQUE IMMUNITATIBUS EIDEM ADNEXIS

DIE IV MENSIS NOVEMBRIS MDCCCCVII

EX UNANIMI ORDINIS PHILOSOPHORUM SECT. I DECRETO CONTULIT.

IN HUIUS REI TESTIMONIUM HOC PUBLICUM DIPLOMA SIGILLIS MAIORIBUS REGIAE LITERARUM UNIVERSITATIS ET FACULTATIS PHILOSOPHICAE ADIECTIS FACULTATIS EIUSDEM DECANUS ATQUE RECTOR MAGNIFICUS UNIVERSITATIS IPSI SUBSCRIPSERUNT.

(LS) (LS)

SUB AUSPICIIS GLORIOSISSIMIS

AUGUSTISSIMI AC POTENTISSIMI DOMINI DOMINI

OTTONIS

BAVARIAE REGIS

COMITIS PALATINI AD RHENUM BAVARIAE FRANCONIAE ET IN SUEVIA DUCIS CET.

IN INCLYTA UNIVERSITATE LUDOVICO-MAXIMILIANEA MONACENSI

RECTORE MAGNIFICO

PLURIMUM REVERENDO AC DOCTISSIMO ET ILLUSTRISSIMO VIRO

MAXIMILIANO ENDRES

OECONOMIAE PUBLICAE DOCTORE POLITICAE ET HISTORIAE SILVATICAE PROFESSORE PUBLICO ORDINARIO CET.

PROMOTOR LEGITIME CONSTITUTUS

EXPERIENTISSIMUS ET SPECTATISSIMUS VIR

HERMANNUS WILHELMUS BREYMANN

PHILOSOPHIAE DOCTOR PHILOLOGIAE ROMANICAE AC FRANCOGALLICAE PROFESSOR PUBLICUS ORDINARIUS ORD. S. MICHAELIS CL. III EQUES CET.

یادگار مشاعرہ

"روزگارِ فقیر" کی جلد اوّل میں "ایک جلسہ" کے عنوان سے پہلی جنگِ عظیم کے سلسلے میں منعقد ہونے والی جس تقریب کا حال شائع ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق مشہور شاعر اور اہلِ قلم جناب جگن ناتھ آزادؔ نے اپنے نامور والد تلوک چند محرومؔ کی جانب سے جلد دوم کی ترتیب کے دوران ایسی وضاحت لکھ کر بھیجی ہے، جس سے واقعے کے بعض اور پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔

جناب تلوک چند محرومؔ کی توضیحی سطور ذیل میں لفظ بلفظ درج کی جا رہی ہیں:

"وہ جلسہ نہیں تھا، پنجاب پبلسٹی کمیٹی کی طرف سے ایک عظیم مشاعرہ تھا، جس کی صدارت کچھ وقت کے لیے خود لیفٹیننٹ گورنر نے کی۔ پنجاب اور دہلی سے شعراء کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ بندۂ محرومؔ بھی مدعو اور شرکاء میں شامل تھا۔ علامہ اقبال کے علاوہ ناظرؔ، نیرنگؔ، دہلی کے نواب سائلؔ اور برقؔ مرحوم بھی شامل تھے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کا حفیظ جالندھری میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مشاعرے میں ظفریہ نظمیں پڑھی گئیں۔ لیکن علامہ اقبال کی دو مختصر نظمیں (ایک اردو اور دوسری فارسی) اپنی مثال آپ تھیں۔

فارسی نظم تو یہی تھی، جس کا حوالہ "روزگارِ فقیر" میں

ہے اور اردو کے متعلق شیخ اعجاز احمد کا بیان درست ہے یعنی "صبح جب میری نگہ" والی نظم تھی۔ ان دو شعروں کے علاوہ ایک اور شعر مجھے اب تک یاد ہے ؎

تو کوئی ننھی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں

علامہ نے دونوں نظمیں شیخ پر ٹہل ٹہل کر ترنم سے اور زبانی سنائیں۔ آواز نہایت دل کش، پرسوز اور دل نشیں تھی میں نے آج تک ایسا پُر تاثیر نغمہ نہیں سنا۔ سناتے سناتے وہ ایک شعر بھول گئے۔ برابر سوچنے کے انداز میں کوئی آدھا منٹ ٹہلتے رہے اور پھر سر اٹھا کر اگلا شعر اسی لے میں ادا کر دیا۔ ان کی خموشی کے دوران میں مکمل سناٹا چھایا رہا۔ اس مشاعرے میں تین انعام بھی مقرر تھے۔ جج علامہ اقبال تھے۔ انھوں نے مقابلے میں شامل ہونے والے شعراء کی نظمیں اپنے مکان پر منگوالیں اور چند روز میں فیصلہ دیا۔ انھوں نے پہلے اور دوسرے انعام کا مستحق دو ہندو شاعروں کو اور تیسرے انعام کا مستحق ایک مسلم شاعر کو ٹھہرایا۔"

اس وضاحتی نوٹ کے بعد جناب جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے والدِ محترم ہی کو پہلا انعام دیا تھا۔ ان کی جو نظم انعام کی مستحق قرار پائی

تھی، وہ ایک قصیدہ تھا جسے اب کلامِ محرومؒ سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلع یہ تھا ؎

چلی گلزارِ عالم میں نسیمِ فضلِ رحمانی
فرو آخر ہوئی جنگِ جدل کی شعلہ افشانی

سائنس کی بے مائگی

۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے کہ نیاز محمد خاں سی ایس۔پی، ممتاز حسن اور میاں نصیر احمد (چیئرمین پبلک سروس کمیشن) میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبال سے ملنے کے لیے گئے۔ علامہ نے ان طلباء سے دریافت کیا، تم کون سے مضامین پڑھتے ہو؟

میاں نصیر احمد نے جواب دیا "فزکس اور کیمسٹری۔" Physics & Chemistry

یہ سن کر علامہ نے نظریۂ اضافیت Theory of Relativity کا ذکر شروع کر دیا اور فرمایا، اس تھیوری کو سمجھنے کے لیے میں نے ریاضی کا مطالعہ بھی کیا۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں، نظریۂ اضافیت کا یہ مطلب ہے کہ

"دنیا ازلی و ابدی نہیں ہے، بلکہ یہ پیدا ہوئی ہے اور اسے فنا ہو جانا ہے۔"

میاں نصیر احمد نے عرض کیا، آج کل ایک امریکی ماہرِ طبیعیات، جس کا

نام پروفیسر کامپٹن Prof. Compton ہے لیکچر دینے کے لیے لاہور آیا ہوا ہے (جس نے نوبل پرائز پانے کی وجہ سے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی۔) اگر آپ اس کا لیکچر سُننے چلیں اور اس سے تبادلۂ خیالات کریں تو اس کا نتیجہ یقیناً مفید رہے گا۔

علامہ نے فرمایا "میں ضرور جاؤں گا۔"

اس لیکچر کا انتظام گورنمنٹ کالج لاہور کے فزکس تھیئیٹر میں کیا گیا تھا۔ میاں نصیر احمد کہتے ہیں کہ جب میں لیکچر ہال میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ علامہ سب سے آخری بنچ پر بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ امریکی پروفیسر کی تقریر ختم ہوئی تو اُس نے سامعین کو سوالات کی دعوت دی۔

علامہ نے اس وقفۂ سوالات کے دوران پروفیسر کامپٹن سے کئی اہم سوالات کیے، جو اس قدر عالمانہ اور پیچیدہ تھے کہ میاں نصیر احمد کے قول کے مطابق اُن کی فہم و ادراک کی وہاں تک رسائی نہ ہو سکی، اور سمجھ سے بالاتر ہونے کے سبب ہی انھیں یادداشت میں محفوظ نہ رکھا جا سکا۔ البتہ پروفیسر کامپٹن کے جواب کا مفہوم اُن کے ذہن نشین رہا۔

اُس نے علامہ کے سوالات سے تقریباً عاجز ہو کر کہا تھا ——

"سائنس قطعی طور پر ان سوالات کے جواب نہیں دے سکتی۔"

احترامِ رسولؐ

محترم حکیم احمد شجاع جو علامہ اقبال کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے انھوں نے ایک ایسا واقعہ سنایا، جس سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال حضور نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ اقدس سے کس درجے والہانہ محبت اور بے پناہ عشق رکھتے تھے۔ یہ واقعہ دیکھنے اور پڑھنے میں بہت مختصر ہے، مگر حقیقت میں عشق و محبت کا دفتر بے پایاں ہے۔

ایک روز حکیم صاحب موصوف علامہ کے مکان پر پہنچے تو علامہ کو بہت زیادہ فکرمند، مغموم اور بے چین پایا۔ حکیم صاحب نے گھبرا کر دریافت کیا "خیریت تو ہے، آپ آج خلافِ معمول بہت زیادہ مضطرب اور پریشان نظر آتے ہیں؟"

علامہ نے خاص انداز میں نظریں اوپر اٹھائیں اور غم انگیز لہجے میں فرمایا:

"احمد شجاع! یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے[1]۔"

---

[1] علامہ مرحوم کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ اس حساب سے ۱۹۳۸ء میں انتقال کے وقت اس عاشقِ رسولؐ کی عمر رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سنِ مبارک سے دو سال کم یعنی ۶۱ سال تھی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے علامہ کی اس تمنا اور دُعا کو قبول فرمایا۔

بازارِ حکیماں کی محفلیں

میرے محترم بزرگ حکیم احمد شجاع فرماتے ہیں :

"جس زمانے میں ڈاکٹر لائٹنر کے علمی ذوق اور توجہ کی بدولت پنجاب میں اردو کا باغ پھول پھل لا رہا تھا اور "پنجاب سکشا سبھا" کی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔ میرے والد ماجد حکیم شجاع الدین محمد جو اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب، فلسفی اور ادیب تھے اور سخن فہمی اور سخن گوئی سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے "سکھشا سبھا" کے مفید کارناموں سے متاثر ہو کر "اردو بزمِ مشاعرہ" کی بنا ڈالی۔

"شورِ محشر" اس بزم کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے عم زاد بھائی اور فقیر سید نجم الدین کے ماموں حکیم امین الدین (بیرسٹر ایٹ لاء) کے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ رسالے کے ایڈیٹر خان احمد حسین خاں مرحوم تھے جو ایک ناول نگار، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ اسی ماہنامے (شورِ محشر) میں مشاعرے کی روداد بھی شائع ہوتی تھی۔ علامہ اقبال ان مشاعروں میں نہ صرف یہ کہ شریک ہوتے بلکہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ اسی بزم کے ایک مشاعرے میں اقبال مرحوم نے وہ شعر پڑھا جسے سن کر اربابِ ذوق چونک پڑے اور بہت دنوں تک ادبی محفلوں میں اس کا چرچا رہا اور آج بھی ان کا یہ شعر پرانے لوگوں کے وردِ زبان بلکہ حرزِ جاں ہے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے گرے تھے جو عرقِ انفعال کے

"افسوس ہے اکثر لوگ اس شعر کو غلط پڑھتے ہیں اور دوسرے مصرعے میں یوں ردّ و بدل کر دیتے ہیں :

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

"سخن سنج حضرات اور صاحبانِ ذوق محاکمہ اور مقابلہ فرما سکتے ہیں کہ یہ مصرعہ اقبال کے اصل مصرعے سے الفاظ کے در و بست اور مفہوم و معنٰی کے اعتبار سے کس قدر فروتر ہے "قطرے گرے تھے" میں جو بے ساختگی اور برجستگی و روانی ہے "قطرے جو تھے" میں وہ بات کہاں !

"میرے والد حکیم شجاع الدین کے انتقال کے بعد حکیم امین الدین اور حکیم شہباز دین نے مل کر "شورِ محشر" کو جاری رکھنے کی کوشش کی مگر جو نظام ایک بار درہم برہم ہو چکا تھا پھر وہ جمنے اور مرتب ہونے نہ پایا۔ بزرگوں کے جذبِ صادق میں جو برکت اور کشش تھی، نوجوانوں کی ہمت کو وہ میسر نہ آسکی —— مگر یہ بزمِ مشاعرہ ایک عجیب نقش قائم کر گئی۔ وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اس بزم میں شریک ہو کر ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور باہم مل بیٹھنے کی عادت سی ہو گئی تھی، اب ہر روز حکیم شہباز دین کے مکان پر جمع ہوتے اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ گھر علم و ادب کے شیدائیوں کا اچھا خاصا کلب بن گیا۔

"میرے بزرگ حکیم شہباز دین اور حکیم امین الدین بیرسٹر کے یہاں کی محفلیں اور مجلسیں سارے شہر میں مشہور تھیں۔ یہ دونوں مکانات آج بھی آمنے سامنے ہیں اور گزشتہ تہذیب و تمدن کی کتنی ہی داستانیں اپنے در و بام میں لیے کھڑے ہیں۔



بازار حکیماں لاہور میں حکیم شہباز دین اور حکیم امین الدین کی وہ اقامت گاہیں اور چبوترے جو علامہ اقبال اور ان کے ہم عصر احباب کی مجلسی زندگی کا مرکز تھے شعر و شاعری اور بحث و نظر کے ہنگاموں کی آماجگاہ ــــ اب وہ ہنگامے اور رونقیں ماضی کے دھندلکے میں گم ہو چکی ہیں۔ صرف واقعات زندگی کی ایک صدائے بازگشت ہے جو سامنے دی ہوئی بے رنگ تصویر میں بھولی بسری یادوں کا رنگ بھر رہی ہے

یہاں ہر شام، برسوں تک وہ لوگ جمع ہوتے رہے، جن میں سے ہر شخص آسمانِ ادب و شرافت کا درخشندہ ستارہ تھا۔

"حکیم شہباز دین جسمانی طور پر بہت زیادہ لاغر اور نحیف تھے۔ سیخ مُجَ دھان پان، مگر اُن کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جو سمندر کی طرح وسیع اور ابر کی مانند فیاض تھا۔ اُن کی زبان میں شیرینی، مزاج میں انکسار اور اخلاق میں بڑی وُسعت تھی۔ عربوں کی طرح مہمان نواز، خوش خلق اور کشادہ دست۔ اِن صفات نے اُن کے گھر کو علم و ادب کے درخشندہ ستاروں کا آسمان بنا دیا تھا۔ دور دور سے لوگ اِن ستاروں کے دیکھنے اور کسبِ فیض کے لیے آتے ۔۔۔ سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسین، مفتی عبداللہ ٹونکی، فقیر سید افتخار الدین اور سید محمد شاہ وکیل اُن لوگوں میں سے تھے، جو قریب قریب ہر شام کو اس نشست گاہ میں جمع ہو جاتے اور ہنسی خوشی کی باتوں میں علم و ادب کے تذکرے چھڑ جاتے۔"

"حکیم شہباز دین کے یہاں کی اِس نشست کے حاضر باشوں میں کچھ بزرگ تو ایسے ہیں، جو بعد میں اِس قدر مشہور ہوئے کہ اُن کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان میں مولوی احمد دین مرحوم "سرگزشتِ الفاظ" جیسی نادر تصنیف کے نامور مصنف ہیں۔ شیخ گلاب دین "قانونِ شریعت و رواج" کے مؤلف ہیں خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، سید محمد شاہ وکیل اور خلیفہ نظام الدین اپنی خوش طبعی اور

عزلت نشینی کے باعث منظرِ عام پر نہ آسکے اور اُن کے ذاتی جوہر اور کمالات پر گمنامی کا پردہ پڑا رہا، مگر اس علمی مجلس کی وہ رُوحِ رواں تھے۔ اُن کی جرأتِ تنقید اور جوہر شناسی نے اُس دور کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے ذہن و فکر کی تربیت میں حصہ لیا۔ اُسی زمانے میں اقبال جو ابھی تک "علامہ" نہیں ہوئے تھے، جب تک اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سُنا لیتے، کسی عام مجلس میں اُسے نہ پڑھتے۔ "نالۂ یتیم"، "ہلالِ عید" اور "تصویرِ درد" جیسی معرکہ آرا اور شہرۂ آفاق نظمیں کہنے کے بعد علامہ اقبال نے پہلے ان بزرگوں کو سنائیں۔ اس کے بعد انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر دُنیائے اسلام سے خراجِ تحسین و عقیدت وصول کیا۔

"حکیم شہباز دین اور حکیم امین الدین کی اقامت گاہوں کے ان چبوتروں کی سامنے دی ہوئی تصاویر کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ دورِ حاضر کی حکومتیں علمی تحقیقات اور بحث و نظر کے جس اعلیٰ مقصد کے لیے لاکھوں روپے صرف کر کے عظیم الشان آڈیٹوریم اور سمپوزیم ہال تعمیر کراتی ہیں، وہ مقصد ان فرشی محفلوں میں کتنی سادگی اور خوبی سے پُورا ہوتا رہا۔"

فیضِ صُحبت

میرے عزیز دوست ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی جن کا ذکر "روزگارِ فقیر" کی پہلی جلد میں آچکا ہے، ایبٹ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں گلاسگو یونیورسٹی سے M.B., Ch. B. کی ڈگری امتیازی شان کے ساتھ حاصل کی اور

انڈین میڈیکل سروس میں شامل ہو گئے۔ R.I.M.C. میں وہ پہلے ہندوستانی تھے جن کو کمیشن ملا۔ آگرہ، کاکول اور ایبٹ آباد کے فوجی ہسپتالوں کے انچارج رہے اور ڈھائی سال تک عراق میں طبی خدمات انجام دیں۔ ملازمت سے دستکش ہو کر ۱۹۲۱ء میں انگلستان چلے گئے اور وہیں پریکٹس شروع کر دی۔ وقتاً فوقتاً وطن آتے رہے لیکن مستقل قیام لندن میں رہا، جہاں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوران میں اُنھیں علامہ اقبال کی خدمت اور رفاقت کے مواقع ملے۔ نہایت صحیح العقیدہ اور درد مند مسلمان ہیں۔ علامہ کا فیضِ صحبت، اُن کی گفتگو اور خیالات میں صاف جھلکتا ہے اور "جمالِ ہم نشیں" اُن میں خاصا اثر کر گیا ہے۔ "روزگارِ فقیر" کی جلد اول اُنھیں انگلستان میں ملی تو اُنھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اس کا اظہار کیا کہ میں علامہ سے متعلق واقعات اور یادداشتوں کو محفوظ کرنے کا کام انجام دوں گا۔ لیکن کہاں کراچی اور کہاں لندن! یہ بُعدِ مسافت اس کام میں حائل اور مانع رہا۔ اوائل مارچ میں اُنھوں نے یہ اطلاع دی، بلکہ نوید جاں فزا سنائی کہ میں کراچی پہنچ رہا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نہ جانے کب بلاوا آ جائے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم سے متعلق جو یادداشتیں میرے ذہن و حافظے میں محفوظ رہ گئی ہیں اُنھیں آپ کو منتقل کر دوں تاکہ آپ اُن کو قوم تک پہنچا سکیں۔

○

شُہرت

دُوسری گول میز کانفرنس (لندن) کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کی ناک میں کاربنکل قسم کا چھوٹا سا پھوڑا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر قریشی نے اُس کے علاج کے لیے ایک اسپیشلسٹ کا انتظام کیا، جس نے مشورہ دیا کہ کسی تاخیر و تامّل کے بغیر اُن کا آپریشن ہو جانا چاہیے۔ علامہ نے زرشک ہوم جانے اور آپریشن کرانے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر قریشی نے اس پر شدید اصرار کیا اور کہا مرض خطرناک ہے۔ اگر خُدانخواستہ نصیب دُشمناں جان لیوا ثابت ہُوا تو جس طرح آپ فیمس (Famous) ہیں، اسی طرح میں بھی (Famous) ہو جاؤں گا اور دُنیا بھر میں میری شہرت نہیں تشہیر ہوگی کہ میں آپ کی صحیح طور پر دیکھ بھال نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر صاحب اس پر بے ساختہ مُسکرا دیے۔ "پھر یوں" میں لکھ کر رکھے دیتا ہُوں کہ اس کی ذمّے داری آپ پر بالکل نہیں"۔

راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے اور والد صاحب سے بھی بارہا سُنتا رہا ہُوں کہ ڈاکٹر صاحب علاج کی سخت پابندیوں سے بہُت گھبراتے تھے۔ انھیں علاج کا سہل ہونا پسند تھا۔ لذیذ دوائیں شوق سے استعمال فرما لیتے۔ ایک بار حکیم نابینا نے سردے کھانے کا مشورہ دیا اور کہا اس سے آواز درست ہو جائے گی، تو سردے نہایت ہی شوق سے کھاتے۔

حقوقِ تصانیف

ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کی زندگی بہت کچھ قلندرانہ تھی۔ اُن کے مالی حالات کبھی اچھے نہیں رہے، جس کا انھیں احساس بھی تھا، مگر اُن کا یہ احساس کبھی فکر و غم سے آلودہ نہیں ہوا۔ قناعت اور صبر و شکر علامہ کا شعار تھا۔

ایک بار قریشی صاحب نے علامہ کی خدمت میں عرض کیا :

"آپ نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں، اُن کا اگر پبلشر سے معاملہ کر لیا جائے تو حقِ تصنیف کی خاصی رقم مل سکتی ہے جو آپ کے کام آئے گی۔ آپ اجازت دیں تو لندن کے کسی بڑے پبلشر سے بات کروں۔"

علامہ نے خاص انداز میں "نہیں" کہا اور قدرے توقف کے بعد بولے :

"ایک بار مجھے بھی اس بات کا خیال آیا تھا، لیکن پھر میں نے سوچا کہ نہ جانے کتنے ضرورت مند اور مستحق لوگ میری تصانیف کے اس کاروبار سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ شاید اس فائدے میں بیواؤں اور یتیموں کا بھی حصہ ہو۔ اپنی ذات کے لیے ان سب کو اس مفاد سے محروم کر دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔"

ایٹمی توانائی کا راز

ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی نے اس حیرت انگیز واقعے کا انکشاف کیا کہ علامہ اقبال جن دنوں لندن میں تھے تو میں ایک دن دوپہر کو گیارہ بجے اُن سے ملنے

کے لیے گیا۔ وہاں مجھ سے پہلے ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ نوجوان غالباً امرتسر کے کسی مسلمان کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور ۱۹۳۲ء میں اُس نے انگلستان کی کسی یونیورسٹی سے آنرز کے ساتھ انجنیئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اُس نوجوان نے عرض کیا "میرے والد نے مجھے خط لکھا ہے کہ تم نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے، ڈاکٹر اقبال حُسنِ اتفاق سے لندن میں تشریف رکھتے ہیں، اپنے مستقبل کے بارے میں اُن سے مشورہ کرو" (دراصل یہ نوجوان علامہ کے اثر و رسوخ کے ذریعے کسی موزوں کام اور ملازمت کی تلاش میں تھا۔)

علامہ نے اُس نوجوان کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا بلکہ جائزہ لیا اور فرمایا — "تم بڑے صحیح وقت پر آئے ہو۔ تم جیسے نوجوان کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے بعد کہا میں جب ہندوستان سے روانہ ہو رہا تھا تو اس وقت استنبول سے استنبول لائبریری کے لائبریرین کا میرے پاس خط آیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ 'میرے پاس ایٹم توڑنے (Atom Breaking) کا جو نسخہ موجود ہے، اُسے حاصل کرنے کے لیے جرمن مجھ پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں' — اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ میرا خط لے کر استنبول چلے جاؤ اور وہاں اس اہم مقصد کے لیے اپنی زندگی کے کم از کم پانچ سال وقف کر دو۔ اس کام میں جو اخراجات ہوں گے، ان کو پورا کرنے کے لیے اگر مجھے گھر گھر جا کر مانگنا پڑا تو میں ضرور مانگوں گا۔

وہ نوجوان علامہ کے اِس مشورے کو سن کر بولا — "میرے والدین نے

بڑی تکلیفیں اُٹھا کر مجھے لکھایا پڑھایا ہے، اس لیے مجھے آپ کے مشورے پر اچھی طرح سوچنا پڑے گا۔"

افسوس ہے، بات جہاں تھی، وہیں کی وہیں رہ گئی۔ نہ تو یہ نوجوان طالب علم استنبول جانے کی ہمت کر سکا اور نہ علامہ اقبال کسی دوسرے پر اس اہم کام کے لیے اعتماد کر سکے۔ اس طرح سائنس کا یہ عظیم کارنامہ مسلمانوں کی بجائے یورپی اقوام کے مستقبل میں لکھا گیا۔

یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ علامہ مرحوم صرف ایک فلسفی اور شاعر ہی نہ تھے، قرآنِ کریم پر اُن کی نظر عمیق اور مطالعۂ کائنات وسیع تھا۔ زندگی، فطرت اور فلسفۂ زمان و مکان کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا، جس کے بارے میں اُن کی معلومات عالمانہ فکر و نظر کی حامل نہ ہوں۔ حیدر آباد دکن، ہندوستان اور پاکستان میں اُن کی سائنسی دلچسپی اور تصورِ زمان و مکاں پر اب تک کئی قابلِ قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں علامہ کے نظریات کی صداقت کو اُن کے اشعار اور جدید ترین سائنسی معلومات کے موازنہ کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علامہ کے ان تمام افکار و آراء کا سرچشمہ قرآنِ کریم ہی ہے۔ محقق حضرات جب نیوٹن، آئن سٹائن، برگساں، نیٹشے اور کوانٹم کے نظریات کی روشنی میں وقت، زمان و مکاں، جوہری توانائی اور الیکٹرون کے موضوعات پر علامہ کے خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کی وسعتِ نظر پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

پروفیسر آئن سٹائن زمان و مکاں کے جس فرق کو واضح کرنے کے لیے

۱۹۲۵ء میں اپنی کتاب "نیچر آف فزیکل ورلڈ" شائع کرتے ہیں، علامہ اس مفہوم کو مثنوی "اسرارِ خودی" میں ۱۹۱۴ء میں بیان کر چکے تھے۔

علامہ مرحوم نے سائنس کی تعلیم اور تحقیق کے کاموں کو دوسرے لوگوں کی طرح صرف مادی ترقی کا ذریعہ کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس بارے میں ہمیشہ زیادہ حقیقت پسندانہ رائے کا اظہار فرماتے رہے۔

سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، جنھوں نے اقبال اور سائنس کے موضوع پر اب تک کئی اہم کتابیں لکھی ہیں، اپنی تصنیف "اقبال کا تصورِ زمان و مکان" (صفحہ ۲) میں رقمطراز ہیں:—

"اقبال طبیعی سائنس میں بھی ایک قسم کی روحانیت پاتے ہیں اور کائنات کے متعلق تحقیق و تجسس کو عبادت کی قسم قرار دیتے ہیں۔"

علامہ کے متعلق اس رائے کی تصدیق ان کے خطبات سے ہوتی ہے، جو انھوں نے مدراس جب کر دیے تھے اور جو "خطباتِ مدراس" یا "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں:—

"غرض کہ جو تشریح ہم نے اوپر دی ہے، وہ طبیعی سائنس کو ایک نئی روحانیت عطا کرتی ہے۔ نیچر کا علم خدا کی خدائی کا علم ہے۔ جب ہم نیچر کا مشاہدہ کرتے ہیں تو گویا ہم انائے مطلق کے قریب تر ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔"

مندرجہ بالا سطور سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ نے استنبول میں Atom Breaking کے اس خاص نسخے پر تحقیق کو کس قدر اہمیت دی ہوگی۔ یہ نسخہ کب تک ترکی میں محفوظ رہا؟ جرمن اسے لے جانے میں کامیاب ہوئے تو کب؟ اگر اس کا مصنف کوئی مسلمان سائنس دان تھا تو کون؟ اسے اسپین میں لکھا گیا یا عرب میں؟ وہ مسلمان نوجوان جسے علامہ نے اس مقصد کے لیے دعوت دی تھی آجکل کہاں ہے اور علامہ نے اسے مزید کیا بتایا تھا؟ یہ اور بعض ایسے ہی سوالات تحقیق طلب ہیں۔ راقم الحروف نے اس نوجوان کا نام معلوم ہوئے بغیر کیمبرج یونیورسٹی سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن خاطر خواہ معلومات نہ مل سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ترکی سفارت خانہ برائے پاکستان سے اُس ترکی لائبریرین یا عالم کا پتہ لگانے میں تعاون کی درخواست کی گئی۔ وزارتِ خارجہ پاکستان کے ذریعے پاکستانی سفارت خانہ برائے ترکی سے مراسلت شروع کی گئی۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۹۷۴ء کو وزارتِ خارجہ پاکستان کی طرف سے مصنفِ "روزگارِ فقیر" کو ایک خط موصول ہُوا، جس میں ڈائرکٹر وزارتِ خارجہ پاکستان کے نام سفارت خانۂ پاکستان برائے ترکی کا ایک خط اور مطلوبہ معلومات کی ایک نقل ملفوف تھی۔ ان معلومات میں کہا گیا ہے کہ

"ترکی میں علامہ اقبال کے ایک بڑے اچھے دوست پروفیسر خلیل خالد گزرے ہیں۔ خلیل خالد ایک معروف ترک خاندان کے فرد تھے۔ آکسفورڈ میں تعلیم مکمل کی۔ استنبول یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ علامہ سے اُن کی خط وکتابت کا

ذکر مکاتیب اقبال کے مجموعوں میں آچکا ہے۔ ایک خط میں علامہ پروفیسر خلیل خالد کو بعض کتابیں تجویز کر کے ان کے ناموں کی فہرست بھیجتے ہیں اور انھیں Prof. A. Fischer of Lipzig سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔"

خیال غالب ہے کہ علامہ نے مندرجہ بالا واقعے میں جس ایٹمی نسخے کا حوالہ دیا تھا، اس کا تعلق کسی لائبریرین سے نہیں، پروفیسر خلیل خالد سے ہو سکتا ہے۔ پروفیسر خلیل خالد بقید حیات ہوتے تو شاید یہ مسئلہ مسئلہ نہ رہتا بلکہ ساری دنیا اس پوشیدہ حقیقت سے باخبر ہو کر حیران رہ جاتی۔ کیا عجب تھا کہ اس واقعے کی مکمل تحقیق کے نتیجے میں مسلمانوں کی علمی عظمت کا کوئی شاندار پہلو سامنے آسکتا۔ مگر کیا کیا جائے کہ قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ اس حقیقت پر گمنامی کا پردہ پڑا رہے۔ بہرحال یہ مسئلہ اقبالیات، سائنس اور خصوصاً ایٹمی توانائی کے استعمال کی دریافت پر تحقیق کرنے والوں کے لیے دعوتِ غور و فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال اور ممتاز حسن

جناب ممتاز حسن شعر و ادب کے قدر شناس اور علم دوست ہیں۔ ان کا علمی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ مختلف زبانیں جانتے ہیں۔ سات سال تک وزارتِ خزانہ حکومتِ پاکستان کے سیکرٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اور اِن دنوں نیشنل بینک آف پاکستان کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ مختلف عہدوں اور سرکاری فرائض کے ہجوم میں بھی انھوں نے علم و ادب اور تاریخ و ثقافت میں قابلِ قدر دلچسپی لی ہے۔ زبان، علم، ادب، آرٹ اور ثقافت کی کتنی انجمنیں اور ادارے ہیں، جن کی وہ معاونت، سرپرستی بلکہ رہنمائی کر رہے ہیں اور ایک مخلص دوست کی حیثیت سے مجھے اُن کی زندگی کا یہ پہلو سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال سے موصوف کا تعلق ایک دوست اور ہمعصر کا نہیں عقیدت مند مداح اور خوشہ چین کا ہے۔ علامہ اقبال سے وہ اپنے والد کے واسطے سے دیرینہ نسبت رکھتے ہیں۔ اُن کے پدر بزرگوار خان صاحب محمد حسن اور علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں ساتھ پڑھتے رہے۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی اور خیال و فکر کی یکرنگی کا یہ عالم تھا کہ جب محمد حسن صاحب نے

Muslim Rights Protection Board

کے نام سے ایک تنظیم کا آغاز کیا تو علامہ اُس کے صدر اور محمد حسن مرحوم سیکرٹری قرار پائے۔ یہ بورڈ مسلمانوں کی ہر قسم کی شکایتیں سن کر اُن کے ازالے کی سعی کرنے کی

غرض سے قائم ہوا تھا۔ ہر شخص اس بورڈ کے سامنے اپنی تکلیف اور ضرورت بیان کر سکتا تھا۔ بورڈ مذکور ۲۳-۱۹۲۲ء تک اپنی استطاعت اور وسائل کے مطابق مسلمانوں کی خدمت کرتا رہا۔ محمد حسن جن کا اصل وطن گوجرانوالہ تھا، بعد میں خان صاحب محمد حسن سینیئر سب جج کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور علامہ اقبال سے اُن کے روابط آخر دم تک رہے۔ ان روابط کی بنیاد اخلاص اور بے غرضی پر تھی، اس لیے اُن میں کوئی الجھن اور کھنڈت پیدا نہیں ہوئی۔

ممتاز حسن صاحب نے علامہ کو سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں دیکھا۔ جب "اسلام اور اجتہاد" کے موضوع پر لیکچر دینے کے لیے اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں تشریف لائے۔ صحت مند، موزوں اندام، سرخ و سفید رنگت، انگریزی سوٹ زیب تن کیے ہوئے سر پر ترکی ٹوپی۔ نہایت متین و سنجیدہ لہجے میں تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں انھوں نے جب ترکی شاعر ضیا کی نظم پڑھی تو آواز میں خاصا جوش پیدا ہو گیا تھا۔

پہلی ملاقات

ابھی تک ممتاز حسن نے دور ہی کے جلوے دیکھے تھے۔ یہ پہلا دیدار تھا، جو انھیں میسر آیا۔ علامہ مرحوم سے ملاقات کا شرف ۱۹۲۶ء میں حاصل ہوا۔ ممتاز صاحب اپنے ہم جماعت دوست نیاز محمد خاں[1] کے ہمراہ علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی نمبر ۳ پر ملاقات کے لیے گئے۔ یہ دونوں دوست ان دنوں فورمین

---

[1] سی۔ ایس۔ پی۔ سابق چیف کمشنر، کراچی

کرسچین کالج لاہور میں تھرڈ ایئر میں پڑھتے تھے اور اپنے ہوسٹل نیوٹن ہال سے پیدل چل کر علامہ کی قیام گاہ پر پہنچے۔ کوٹھی کے باہر گیٹ پر علامہ کے نام کا ایک بوسیدہ سا بورڈ بڑی بے نیازی کے ساتھ آویزاں تھا۔ اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوٹھی کے برآمدے میں علامہ اقبال چند اصحاب کے ساتھ بڑے سادہ انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ طالب علم ـــــ علامہ اقبال، غیر معمولی شہرت کے مالک۔ انھیں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ پھر آدابِ ملاقات اور شائستگی کے بھی کچھ تقاضے تھے۔ یہ دونوں دوست ملازموں کے کوارٹروں کی طرف چل دیے، جہاں اُن کی ادھیڑ عمر کے ایک دبلے پتلے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ ممتاز حسن فرماتے ہیں کہ یہ وہی شخص تھا جسے ہم بعد میں ہمیشہ اپنے دوست علی بخش کے نام سے یاد کرتے رہے۔

نوجوانوں نے علی بخش کے ہاتھ میں اپنا کارڈ تھمادیا اور کہا کہ ہم علامہ کی خدمت میں اُن سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ اِس پر علی بخش اپنے خاص انداز میں مسکرایا اور کہنے لگا یہاں کارڈ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھو، ڈاکٹر صاحب وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ تم بھی وہاں جاکر بیٹھ جاؤ۔ آخر ان کے اصرار پر کہ ملاقات کے لیے اجازت ضروری ہے، علی بخش قدرے جھجکتے اور سوچتے ہوئے کارڈ لے گیا، لیکن فوراً ہی اُلٹے پاؤں واپس آیا اور کہنے لگا ـــــ "جائیے" ـــــ اُس کے اندازِ کلام اور جاکر فوراً واپس آنے سے ایسا محسوس ہوا جیسے علامہ نے کارڈ دیکھے بغیر ہی ملاقاتیوں کو بُلا لیا تھا۔

وجودِ باری

جو لوگ علامہ اقبال کے پاس پہلے سے بیٹھے تھے وہ جب تک گفت گو کرتے رہے، ممتاز حسن خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب یہ حضرات اٹھ کر چلے گئے تو ممتاز صاحب نے کہا "ڈاکٹر صاحب! اگر اجازت ہو تو ایک بات میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں؟" علامہ نے فرمایا "کیا؟"

ممتاز حسن نے علامہ اقبال کو اپنی طرف متوجہ پاکر عرض کیا۔ آپ ایک دانش ور فلسفی ہیں اور نہ صرف یہ کہ قدیم و جدید فلسفوں سے اچھی طرح آگاہ و باخبر ہیں، بلکہ آپ اپنی جگہ خود بہت بڑے مفکر ہیں، مگر اس کے باوجود آپ اپنے اشعار اور مقالات میں خدا کا ذکر غیر فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے امانوئل کانٹ کے فلسفیانہ افکار کی روشنی میں اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محض عقل و فلسفہ کی رُو سے نہ تو خدا کے وجود کا اثبات ممکن ہے اور نہ اس کی تردید اور خدا کے بارے میں جب بھی فلسفے کی رُو سے گفتگو ہو گی تو لازمی طور پر ہم وہی کہیں گے جو کانٹ نے کہا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ اتنے بڑے مفکر اور فلسفی ہیں، پھر آپ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کے وجود پر عقلی دلیل لانے کی بجائے خوش اعتقادی کے ساتھ اس کا ذکر کریں؟

علامہ اقبال ممتاز حسن کے خیالات بڑی خاموشی اور ہمدردی کے ساتھ سنتے رہے۔ انھوں نے نہ تو درمیان میں ٹوکا اور نہ ہی تعجب کا اظہار کیا۔ جب ممتاز حسن

اپنی بات پوری کر چکے تو علامہ نے فرمایا :۔

"خدا کے متعلق پوچھتے ہو ؟ میں نے اُسے دیکھا ہے۔"[1]

علامہ زیرِ لب مسکرائے اور تھوڑے سے توقف کے بعد مزید فرمایا :۔

"انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ خدا کو دیکھ سکتا ہے لیکن یہ لمحے کم نصیب ہوتے ہیں۔"

اور کچھ توقف کے بعد پھر فرمایا "بہت ہی کم"۔

ممتاز صاحب نے دریافت کیا "کیا ہر شخص کے لیے خدا کا مشاہدہ ممکن ہے ؟"

علامہ نے فرمایا "یہ دروازہ کسی پر بند نہیں ہے۔ لیکن جو شخص مشاہدے کا طالب ہو۔ اُسے صبر اور انتظار لازم ہے۔"

---

[1] یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔ اس لیے علامہ کے اصل فقرے انگریزی میں بھی درج کیے جا رہے ہیں :۔

"I have seen him. There are moments in a man's life when he can experience God."

"Such moments are, however, rare" he added, a little later "very rare"

"No one is shut out but he who wants the experience has to wait for it."

موت کا وجود

مزید گفتگو کے دوران کہیں موت کا ذکر بھی آگیا۔ جناب ممتاز حسن بیان کرتے ہیں کہ میں بعض ذاتی تاثرات کی بنا پر حیات بعد الموت کے مسئلے میں اُلجھا ہُوا تھا۔ جیسے ہی میرے منہ سے لفظ "موت" نکلا، علامہ نے کسی تامّل کے بغیر فرمایا —

"موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اصل حقیقت زندگی ہے، موت نہیں —"

یہ گفتگو انگریزی میں ہُوئی۔ علامہ نے اس موقع پر انگریزی میں جو فقرے کہے، وہ یہ تھے:

''Death does not exist. It is life that is the predominant reality, not death.''

'وجودِ باری' کی طرح علامہ اقبال نے یہ بات بھی اسی قدر قطعیت اور یقین کے ساتھ کہی کہ ممتاز صاحب کے بیان کے مطابق انھیں مزید گفتگو کی جرأت ہی نہیں ہُوئی اور اس کے بعد وہ اپنا کوئی شک و شبہ پیش ہی نہ کر سکے۔ وہ فرماتے ہیں —

"علامہ اقبال سے یہ پہلی ملاقات آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔"

اِنسانی جسم

ممتاز حسن بیان کرتے ہیں کہ اس پہلی ملاقات کے بعد مجھے بارہا علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا۔ ایک مرتبہ انسانی جسم کی ساخت' اُس کی قوتِ طبیعی اور انحطاط کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ ——

"رُوح غیر فانی ہے اور جسم فانی ہے۔"

علامہ نے اِس موقعے پر یہ فرمایا کہ ——

"انسانی جسم کے لیے بھی غیر فانی حیثیت اختیار کر لینا ممکن ہے۔"

پاس بیٹھے ہُوئے ہر شخص کو تھوڑی دیر کے لیے حیرت میں ڈال دیا۔

طبیعت کا توازن

علامہ کو کتابوں سے شغف نہیں' عشق تھا۔ ہر فن کی کتابیں مطالعہ کرتے۔ مطالعے کے معاملے میں ان کا سچ مچ یہ عالم تھا کہ ——

راتیں گزار دی ہیں سہارے چراغ کے

اُن کی ساری زندگی ایک طالب علم کی طرح کتابوں کے مطالعے میں گزری۔ جتنا پڑھتے' علم کی پیاس اور بڑھتی جاتی —— ایک بار کسی نے دریافت کیا، "اِس قدر مطالعہ کرنے سے آخر کیا حاصل ہے؟"

جواب میں فرمایا ——

"یہ تو مجھے دوسری دنیا میں بھی کام دے گا۔"

لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہو جانے کے کچھ دن بعد ممتاز حسن سے دورانِ گفتگو علامہ نے فرمایا ــــــ

"کونسل میں میرے جانے کا بڑا سبب یہ ہے کہ میری طبیعت کا رخ علمی مشاغل کی طرف اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ توازن قائم رکھنے کے لیے میں نے دنیا کے عملی معاملات میں دلچسپی لینا ضروری سمجھا۔"

اس سلسلے میں مزید فرمایا ــــــ

"جب میں کیمبرج میں تھا تو فلسفہ کے ساتھ ساتھ اس غرض سے معاشیات کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا اور اس موضوع پر لیکچر بھی سنا کرتا تھا کہ مسلسل فلسفہ پڑھنے اور سوچنے سے ذہن میں یک طرفہ پن پیدا نہ ہو اور طبیعت کا توازن قائم رہے۔"

واقعہ بھی یہ ہے کہ زندگی میں حسن اور صحت و توانائی توازن و اعتدال ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام ترکِ دنیا اور رہبانیت کو پسند نہیں کرتا۔

عام گفتگو

علامہ کی گفتگو کے سادہ لیکن دلکش انداز کی کیفیت جلد اول میں بیان کی جا چکی ہے۔ ممتاز حسن اپنے ذاتی مشاہدے کی بناء پر ایک اور نکتہ واضح کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اگرچہ علامہ کو مختلف زبانوں پر اس قدر عبور تھا کہ جس موضوع پر جس زبان میں چاہتے گھنٹوں گفتگو کر سکتے تھے، لیکن اُن کی عام گفتگو کسی قسم کے

تکلف اور پابندی سے آزاد تھی۔ گفتگو کرتے وقت اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے جس زبان کا لفظ (مخاطب کی علمی حیثیت کے لحاظ سے) موزوں سمجھتے' بلا تامل استعمال کر لیتے۔ گویا اُن کا مفہوم کسی خاص زبان کا پابند نہ ہوتا اور نہ وہ مفہوم کے اظہار اور الفاظ کے استعمال میں کسی خاص زبان کی محتاجی یا اجارہ داری کے قائل تھے۔

سادگی

ایک بار ممتاز حسن صاحب کے ایک عزیز دوست نے علامہ کے سامنے کہہ دیا کہ "خدا نے ضرورت سے زیادہ انسان پیدا کر دیے ہیں' جن میں سے اکثر کی زندگی فضول اور بے معنی ہے"۔

علامہ نے اس رائے کی بڑے پُرجوش انداز میں تردید کی۔ فرمایا ــــــ

"ہر ایک انسان اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور کسی کا وجود بے کار نہیں ہے' لیکن اس حقیقت کا پتہ اس وقت چلتا ہے' جب ہمیں کسی شخص سے اچھی طرح سابقہ پڑے اور ہم اُسے قریب سے دیکھیں ــــــ"

ایک دن علامہ اقبال حسبِ معمول بنیان پہنے اور تہبند باندھے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ حقہ سامنے تھا اور احباب سے تبادلہ خیال جاری تھا۔ ممتاز حسن بھی اس صحبت میں شریک تھے۔ اتنے میں دو قدآور فوجی جوان' جو وضع قطع سے شمالی پنجاب کے کسی ضلعے کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے' وہاں آئے اور بڑی خاموشی کے ساتھ خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک

نے ممتاز حسن سے پوچھا ــــ

"ترجمانِ حقیقت' حضرت علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم اے، پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاء، ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل کہاں ہیں؟"

ممتاز صاحب کو اس سوال پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ ایک صاحب نے اُن کے ہنسنے کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا ــــ

"یہ صاحب 'ترجمانِ حقیقت' حضرت علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال .... کی تلاش میں ہیں، وہ ان کو ابھی تک نہیں مل سکے۔"

اس پر اُن صاحب نے، جو اقبال کے پرانے دوست، اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر محمد شفیع تھے، ان نوجوانوں کی طرف دیکھا اور اقبال کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ کون بیٹھا ہے؟"

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ ان قہقہہ لگانے والوں میں خود علامہ بھی شامل تھے۔ اس قہقہے کے انداز سے وہ فوجی نوجوان سمجھ گئے کہ "ترجمانِ حقیقت' علامہ اقبال...." جن کی تلاش میں وہ یہاں آئے ہیں، اُن کے سامنے بیٹھے ہیں۔

یہ بے چارے علامہ اقبال کی شہرت اور عظمت کا یہ تصور لے کر آئے تھے کہ علامہ بہت بڑے آدمی ہیں، اس لیے وہ بڑے تزک و احتشام اور ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہوں گے۔ دولت کدے پر چوکی پہرہ ہوگا۔ اُن سے ملنے میں بڑی دشواری پیش آئے گی اور کیا عجب کہ پہلی کوشش میں اُن تک رسائی ہی نہ ہو سکے، مگر یہاں ان کو ہر طرف قلندریت نظر آئی۔ بے تکلفی کا ماحول اور سیدھی سادی زندگی؛

بذلہ سنجی

جناب عبداللہ چغتائی سے علامہ کو بڑا لگاؤ تھا۔ ان کی ملاقات کے منتظر رہتے، اُن کی باتیں سنتے اور محظوظ ہوتے۔ اگر ان سے ملاقات ہوئے زیادہ مدت ہو جاتی تو خود انھیں بُلاتے۔ ایک بار چغتائی صاحب عرصے کے بعد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ نے انھیں دیکھتے ہی فرمایا ــــــ

"عبداللہ! اتنے دنوں سے کہاں تھے؟"

چغتائی صاحب نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! کیا عرض کروں، آج کل اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی اور فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں ملتا۔"

علامہ نے اس جواب پر بے اختیار قہقہہ لگایا اور فرمایا ــــــ

"عبداللہ! تم نے آج وہ بات کہی ہے جو آئن اسٹائن کے باپ کو بھی نہیں سوجھی ہوگی۔"

زندگی کی توہین

جن لوگوں کو شکار کا شوق ہوتا ہے، وہ عموماً اپنے شکار کیے ہوئے جانوروں کی کھالیں اور کٹے ہوئے سر دیواروں پر نمائش کے لیے آویزاں کر دیتے ہیں۔ مکان کی زیبائش کی غرض سے بھی اور یہ دکھانے کے لیے بھی کہ ہم اتنے مشاق

نشانہ باز اور قدر انداز ہیں۔ علامہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے۔ ایک بار بڑے کبیدہ انداز میں فرمایا ـــــ

"مردہ جانوروں کے سر یا دھڑ محفوظ کر کے اُن کی نمائش کرنا زندگی کی توہین کرنا ہے۔"

شجاعت و دلیری

علامہ نے ایک انگریز جرنیل کا ذکر کیا جو اکثر اُن کے پاس آیا کرتا تھا اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ کہنے لگا ـــــ

"مجھے قرآن بہت پسند ہے۔ اکثر میرے مطالعے میں رہتا ہے۔"

علامہ نے دریافت کیا کہ آپ نے قرآن کریم میں ایسی کون سی چیز دیکھی ہے جو آپ کو اس قدر پسند آئی؟"

جرنیل نے جواب دیا ـــــ "قرآن میں دلیری اور مردانگی کی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر انسان میں جرأت اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔"

طبقاتی تقسیم کا تجزیہ

ممتاز حسن فرماتے ہیں کہ ایک دن میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور اتفاق سے ہندو معاشرے میں ذات پات کے بندھنوں کا ذکر چھڑ گیا۔ بحث کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ ہندو سماج نے اپنے آپ کو طبقاتی امتیاز اور کھتری و

برتری کے مدارج میں تقسیم کر رکھا ہے اور یہ فرسودہ روایت اچھی خاصی اصلاح کی محتاج ہے۔ علامہ نے اس خیال سے اتفاق کیا۔ دورانِ گفتگو میں نوعِ انسانی کے ارتقا کا ذکر آیا۔ اس وقت علامہ پر خوش طبعی کی کیفیت غالب تھی۔ ذات پات کی تمیز اور نوعِ انسانی کی تدریجی ترقی دونوں اُن کے ذہن میں تھیں۔ از راہِ تفنن فرمایا :-

"اگر غور سے دیکھیے تو ان مختلف ذاتوں کا تدریجی اقتدار ساری نوعِ انسانی کی تاریخ میں نظر آئے گا۔ ابتدائی دور میں مختلف قوموں اور قبیلوں میں اُن لوگوں کی حکومت نظر آتی ہے، جو دوسروں سے زیادہ دانشمند اور تجربہ کار تھے، سحر و طلسم کا مظاہرہ اور مذہبی رہنمائی انھیں سے متعلق تھی۔ یہ قوم کے معتبر رہنماؤں اور پروہتوں کی حکومتوں کا دور تھا، اسے برہمنوں کی حکومت کہہ لیجیے۔"

"اس کے بعد کئی صدیاں نوعِ انسانی کی تاریخ میں ایسی گزری ہیں جب تلوار چلانے والوں نے اقتدار سنبھالا۔ یہ بادشاہوں کی حکمرانی کا دور ہے جسے کشتریوں (چھتریوں) کی حکومت کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔"

"اس کے بعد ہمارا اپنا زمانہ ہے اور یہ ہے ویشوں کی حکومت ——
تم دیکھو گے کہ آج کل دُنیا میں تجارت اور تجارتی منافع کی اہمیت ہے۔ بڑے بڑے "Merchant Princes"[1] یعنی ملک التجار سیاسیاتِ عالم پر اتنا اثر رکھتے ہیں کہ امن و جنگ کا انحصار بڑی حد تک انھیں کی مرضی پر ہے ——"

اس پر ممتاز حسن نے کہا ——

---

[1] انگریزی میں گفتگو کے دوران علامہ نے یہی لفظ استعمال کیے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! تاریخ عالم کے متعلق آپ کی اس دلچسپ تشریح کو تسلیم کر لیا جائے تو آئندہ زمانے میں کس طبقے کی حکومت ہونی چاہیے؟"

ڈاکٹر صاحب نے مُسکرا کر فرمایا ـــــ

"کیا آپ کے سوال کا جواب مزدور طبقہ نہیں دے رہا ہے؟"

زندگی اور عمل

میرے عزیز دوست ممتاز حسن فلسفے کے طالب علم رہے ہیں۔ مشرق و مغرب کے عُلماءِ فلسفہ کے افکار کا انھوں نے خاصا مطالعہ کیا ہے۔ خود علامہ اقبال سے ان کی پہلے پہل ملاقات ہوئی تو اس میں فلسفیانہ ذوق ہی کارفرما نظر آتا ہے۔ علامہ ہی کی ہدایت نے ان کو باطنی واردات اور اشراق و وجدان کی جانب مائل کیا۔

ممتاز صاحب اس خیال کے حامی و مؤید نہیں ہیں کہ علامہ کے افکار خود اُن کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ گوئٹے اور نیٹشے کے نظریات سے مستعار ہیں۔ صاحب موصوف نے خوب سوچ سمجھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ مغرب کے علماءِ فلسفہ اُسی چشمۂ فیض کے رہینِ منت ہیں جو اقبال کے فکر و فلسفے کا منبع ہے۔ اقبال کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے صاحبِ وجدان ہونا ضروری ہے۔

ممتاز حسن پُورے وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ جو اصحاب علامہ اقبال سے ملے ہیں انھیں اقبال کے چشمۂ فیض سے کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور پہنچا ہے۔ خاص طور سے وہ طلبہ جو علامہ کی خدمت میں علمی تحقیق کے

لیے حاضر ہوتے تھے' اُن کی قوتِ فکر و تخلیق پر علامہ کے فیضِ تربیت کا نمایاں اثر ہُوا

ممتاز صاحب کہتے ہیں کہ علامہ اقبال سے مجھے جو سب سے قیمتی سبق اور

نکتۂ حکمت ملا' وہ یہ ہے ——

"زندگی کا کوئی لمحہ بے کار نہ گزرے"۔

اور میں زندگی کے اس نکتے کو حضورِ رسالت مآب کے اس ارشاد کی روشنی

میں ہمیشہ درست اور قابلِ عمل پاتا ہُوں ——

من استوٰی یوماہ فھو مغبون ۔

یعنی، جس شخص کے دو دن یکساں گزر جائیں' وہ بڑے گھاٹے میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

ایک روز میکس[1] پلانک کے نظریۂ کوانٹم[2] اور اس کے بعد کی علمی تحقیق کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ممتاز حسن نے سائنس کی اس دریافت کا ذکر کیا کہ جب بہت سے برقیے مل کر حرکت کرتے ہیں تو ان کا عمل یکساں ہوتا ہے' یعنی اس عمل کے نتائج یکساں ہوتے ہیں لیکن جب ایک برقیہ اپنی انفرادی حیثیت میں مصروفِ عمل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ یکساں حالات میں اور یکساں اسباب کے پیشِ نظر اس برقیے کا ردِ عمل یکساں ہو۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اسباب و نتائج کے جس رشتے کی بنیاد پر سائنس کا سارا کارخانہ قائم ہے' خود وہ رشتہ ہی کمزور نظر

---

[1] Max Planck

[2] Quantum Theory

آتا ہے اور کائنات کی بنیادی ساخت میں کچھ غیر متیقن عناصر ایسے ہیں جن کے عمل کے بارے میں کوئی پیشگی اندازہ کرنا ممکن نہیں۔

علامہ نے فرمایا "اب سائنس دانوں پر وہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے جس کو قرآنِ کریم نے مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝[1]

ممتاز حسن علامہ کے اس جواب سے نہایت متاثر ہوئے اور عرض کیا "واقعی قرآنِ کریم کی اس حقیقت پر عام مسلمانوں کی نظر نہیں گئی اور سائنس دان اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ خدائے حقیقی و برتر جو قادرِ مطلق ہے، ان اسباب و نتائج کے محرکات اور تسلسل عمل کے سامنے اصولی طور پر مجبور اور بے بس ہے۔

روشنی

ممتاز حسن بیان کرتے ہیں کہ ایک روز آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے سلسلے میں روشنی کی رفتار کا ذکر آیا تو میں نے کہا——

"عجیب بات ہے، اب تک خلا میں روشنی سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی چیز دریافت نہیں ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی بجائے خود طبیعیاتی نقطۂ نگاہ سے ایک قدرِ مطلق ہے۔" علامہ نے نہایت متانت سے میرا سوال سنا اور فرمایا "کیا تمھیں قرآنِ حکیم کی وہ آیت یاد نہیں:

---

[1] مفہوم: بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

"اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"[1]

کشمیر کے متعلق پیش گوئی

جناب ممتاز حسن فرماتے ہیں کہ ایک روز علامہ کی صحبت میں کشمیر کی سیاسی تحریک پر گفتگو ہو رہی تھی۔ علامہ موصوف فرمانے لگے کہ

"میں نے کشمیر کے متعلق جو نظم "ساقی نامہ" نشاط باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی اُس میں ریشم ساز کارخانوں اور کاریگروں کا ذکر بھی شامل تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعد میں کشمیر کی سیاسی تحریک وجود میں آئی تو اس کی ابتدا ایک ریشم کے کارخانے میں کاری گروں کی بغاوت سے ہوئی۔"

ممتاز حسن کہتے ہیں کہ علامہ کی شہرۂ آفاق تصنیف "پیامِ مشرق" (جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی) کا نسخہ جس پر علامہ کے دستخط بھی ثبت ہیں، میرے پاس موجود تھا۔ میں نے "ساقی نامہ" کو غائر نظر سے دیکھا تو اس کے مندرجہ ذیل تین اشعار نے میرے دل میں علامہ کے اس ارشاد کی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا۔

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

---

[1] مفہوم: اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری

کہ خاکسترش آفرینند شرارے!

(پیام مشرق)

چنانچہ ممتاز حسن جب چند سال قبل آزاد کشمیر تشریف لے گئے تو انھوں نے مظفر آباد میں ایک معزز کشمیری ڈاکٹر عبدالواحد سے سوال کیا کہ کیا وہ تحریک کشمیر کے بالکل ابتدائی وجوہ اور اسباب پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟ اس پر انھوں نے ایک مفصل مضمون قلم بند کر کے ممتاز صاحب کو دیا جو ابھی تک اُن کے پاس محفوظ ہے۔ مضمون کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ "پیام مشرق" کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں اس تحریک کا آغاز ریشم کے کارخانے کے مزدوروں کی ہڑتال اور بغاوت سے ہوا۔ حکومت نے احتجاج کرنے والے مزدوروں اور شہریوں پر گولی چلوادی، جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ حالات پولیس کے قابو سے باہر ہو گئے تو فوج طلب کر لی گئی، جس نے کشمیری عوام پر خوب تشدد کیا۔ انجام کار یہ تحریک دبنے کی بجائے پھیلتی گئی اور کشمیری عوام میں خودداری کا خوابیدہ احساس بیدار ہو گیا اور یہی وہ جذبہ تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط اور پختہ ہوتا چلا گیا۔

"پیام مشرق" میں علامہ اقبال کے وہ اشعار جو انھوں نے ۱۹۲۳ء سے قبل کہے تھے، اُن کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی کہ کشمیر کے مستقبل کے لیے یہ اشعار پیش گوئی ثابت ہوئے۔ جیسے آنے والے واقعات کی پرچھائیاں برسوں پہلے شاعر مشرق کے ذہن و فکر پر منعکس ہو چکی تھیں۔

روشنی اور تاریکی

ایک روز ممتاز حسن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہاں ایک شخص کو بیٹھے دیکھا۔ شکل صورت سے سادھو معلوم ہوتا تھا مگر غیر معمولی قسم کا۔ منڈا ہوا سر، ڈاڑھی مونچھیں صاف، گیروا لباس مگر بہت قیمتی کپڑے کا۔ علامہ کے ساتھ بڑی گرم جوشی کے ساتھ گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ ملاقاتی بار بار علامہ کو "گورو جی" کہہ کر مخاطب کرتا اور دورانِ گفتگو کسی راجہ مہاراجہ کا ذکر بھی کر دیتا۔ جب یہ شخص اٹھ کر چند منٹ کے لیے باہر گیا تو ممتاز حسن نے دریافت کیا "یہ کون ہیں؟"

علامہ نے فرمایا "یہ میرے پرانے دوست ہیں۔ ہر سال مجھ سے آ کر ملتے اور میرے پاس قیام بھی کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مہاراجے ان کے چیلوں میں شامل ہیں"۔ ممتاز صاحب نے سوامی جی کا نام دریافت کیا تو علامہ نے فرمایا۔ "نام تو مجھے یاد نہیں"۔ اتنے میں سوامی جی واپس آ کر بیٹھ گئے اور فلسفیانہ مسائل پر بحث چھیڑ دی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے علامہ سے ایک سوال یہ پوچھا "گورو جی! کیا روشنی اور اندھیرا (Light & Darkness) اکٹھے ہو سکتے ہیں؟"

علامہ نے کہا "ہاں ___ !

سوامی جی حیرت سے بولے "وہ کیسے؟"

علامہ نے فرمایا "In time[1] (وقت میں)۔"

---

[1] علامہ نے انگریزی میں یہی الفاظ استعمال کیے۔

کائنات کی ساخت

ایک روز آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کا ذکر آیا۔ علامہ نے اس موقع پر فرمایا ـــــ "کائنات کی شکل و صورت کا مسئلہ پرانے مسلمان ریاضی دانوں کے بھی پیشِ نظر تھا اور انھوں نے اس مضمون پر بڑا غور و خوض کیا"۔ علامہ نے ایک ہسپانوی مسلمان ریاضی دان ابو المعالی کا تذکرہ کیا، جس کی تحقیقات آئن سٹائن کی تحقیق سے مشابہ تھیں۔ علامہ نے فرمایا کہ آئن سٹائن کا خیال ہے کہ کائنات کی ساخت کم و بیش مدوّر ہے۔ ہمارے مسلمان ریاضی دان کی تحقیق یہ تھی کہ کائنات مخروطی شکل کی ہے۔

آئن سٹائن کا نظریۂ زمان یہ ہے کہ وقت کائنات کی چوتھی "بُعد"[1] ہے۔ علامہ کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ فرمایا "یورپ کے ریاضی دانوں میں جس شخص کے نظریات میرے نزدیک سب سے زیادہ وقیع ہیں، وہ وائل[2] ہے"۔

اِنسان اور ستارے

ایک دن جوتش کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ممتاز حسن نے عرض کیا "جوتش کوئی علم معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی انسان کی زندگی کی جزئیات پر ستاروں کی گردش کا اثر قرینِ قیاس نہیں"۔

علامہ نے فرمایا "غالباً عام طور پر یہ صحیح ہے۔ لیکن بڑی بڑی انسانی

---

[1] Dimension

[2] Weyl

ہستیوں پر ستاروں (کی گردش) کا اثر ہوتا ہے اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جلیل القدر انسانوں کی زندگی ایسے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور قبول کرتی ہے۔

حاکمیّت اور کردار

علامہ نے ایک دفعہ فرمایا:

"خدا جب کسی فرد یا قوم کو حکومت سونپتا ہے تو وہ انھیں موقع دیتا ہے کہ اپنی سیرت میں ایک خاص قسم کے تدبر، عدل اور اخلاق کے اوصاف پیدا کریں۔ چونکہ مروت، عشق، ہمت، فراخ دلی، مردم شناسی اور فیض و بخشش کی اعلےٰ خصوصیات کے بغیر ایک شخص صحیح طور پر حکمران بن ہی نہیں سکتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ——

خدا نے حاکمیت میں تعمیرِ کردار اور تربیتِ سیرت کے جو مواقع رکھے ہیں وہ محکومیّت میں نہیں ہیں —"

معلم آفتاب ہے

ممتاز صاحب سے مخاطب ہو کر ایک روز علامہ نے فرمایا:

ایک بڑے اُستاد اور معلم کی حیثیت سورج کی سی ہے جو اپنی روشنی اور حرارت ہر چیز تک بے کم و کاست پہنچاتا ہے، لیکن اُس کا اثر مختلف چیزوں پر مختلف

ہوتا ہے۔ کسی پر اچھا، کسی پر بُرا۔ آفتاب کی روشنی اور گرمی سے پودوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ انسانی جسم قوت اور توانائی حاصل کرتا ہے اور بوسیدہ چیزیں پہلے کی نسبت زیادہ بوسیدہ اور فاسد ہو جاتی ہیں۔ گویا جس چیز میں اچھی یا بُری جو صلاحیت ہوتی ہے، اس کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ منظرِ عام پر آ جاتی ہے۔

علامہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا — اس اصول کے تحت کسی بڑے استاد کے شاگردوں کا یکساں ہونا ضروری نہیں۔ ہر ایک شخص میں جو صلاحیت موجود ہوگی، استاد کی توجہ اور کوشش سے اسی میں ترقی ہوگی۔ علامہ نے اس سلسلے میں امام موفق نیشاپوری کی مثال پیش کی، جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے تین اکٹھے پڑھتے ہوئے شاگرد عملی زندگی میں بالکل مختلف راہوں پر نکل گئے۔ ان میں سے ایک عمر خیام، دوسرا حسن بن صباح اور تیسرا نظام الملک طوسی بنا۔

کراچی کے متعلق پیش گوئی

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان سے قبل کراچی شہر کی اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ یہ شہر صوبۂ سندھ کا دارالحکومت اور بحیرۂ عرب کا ایک بندرگاہ تھا جس کی آبادی کم و بیش تین لاکھ تھی، لیکن قیامِ پاکستان کے فوراً بعد دُنیا کی عظیم اسلامی مملکت کے دارالخلافہ ہونے کی حیثیت سے اس شہر نے جو ترقی کرنا، پھیلنا، بڑھنا اور متمدن و پر رونق ہونا شروع کیا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گیا۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد!

تو کراچی میں سچ مچ تازہ بستیاں آباد ہوئی ہیں اور سرسری اندازہ یہ ہے کہ اس شہر کی آبادی پچیس لاکھ سے کیا کم ہوگی۔

طرح طرح کی وضع کے بنگلے اور کوٹھیاں، عالی شان عمارتیں، تعلیمی اداروں کی کثرت، کارخانوں کی بہتات، تجارت، سیاست اور پھر بحری و ہوائی مواصلات نے کراچی کو بین الاقوامی اہمیت دے دی ہے۔ مختلف علاقوں اور رنگ و نسل کے باشندوں نے اس شہر کو دیارِ بوقلموں بنا دیا ہے۔

اب سے پچیس تیس برس پہلے اس شہر کی ترقی کے بارے میں کسی ذہن میں کوئی خیال بھی نہ آیا ہوگا —— لیکن حکیم الامت علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (منعقدہ الٰہ آباد) میں ۱۹۳۰ء میں جو خطبۂ صدارت دیا تھا، اس میں مشیتِ ایزدی اور ہاتفِ غیبی نے کراچی کے متعلق ان کی زبان سے ایسی باتیں کہلوائی تھیں، جن کو آج سے ۴۳ سال قبل کی پیش گوئی کہا جائے تو واقعے کی صحیح ترجمانی ہوگی۔ علامہ نے فرمایا ——

"سندھ کی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی جانب، علاوہ ازیں اگر سندھ کے اُن زراعتی مسائل، جن سے حکومتِ بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں اور اس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے۔ اس لیے کہ کراچی بڑھتے

بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دارالسلطنت بن جائے گا۔ تو صاف نظر آتا ہے کہ اس کو احاطۂ بمبئی سے ملحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دور ہے۔ بے شک اس وقت بمبئی کا رویّہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔"

علامہ کو ملتِ اسلامیہ کے عروج و ترقی اور مسلمان نوجوانوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا شدید احساس تھا اور وہ ساری زندگی اس مقصد کے لیے جد و جہد کرتے رہے ۱۹۳۷ء میں جامعۂ ازہر مصر کے علماء کا ایک وفد مسلمانوں کے تعلیمی حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے ہندوستان آیا تو لاہور میں علامہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ علامہ جانتے تھے کہ موجودہ حالات نے مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر رکھی ہیں، اس لیے اُن کی نظر ریاست بہاول پور پر گئی، جہاں خالص اسلامی طرز کے تعلیمی ادارے قائم کرنے پر خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ انھوں نے ریاست بہاول پور کے وزیرِ تعلیم میجر شمس الدین قریشی کو ایک خط لکھا جس میں انھیں مشورہ دیا کہ وہ مصری مشائخ کو بہاول پور آنے کی دعوت دیں۔

یہ نادر خط میجر شمس الدین صاحب اور سنٹرل لائبریری بہاول پور کے شکریے کے ساتھ آئندہ صفحے پر شائع کیا جا رہا ہے۔ جناب ممتاز حسن کی سعیِ جمیلہ سے اس موقعے کا ایک گروپ فوٹو بھی حاصل ہوا ہے جو "حیاتِ اقبال تصاویر میں" کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

(مؤلف)

لاہور ۲۲ دسمبر ۳۶ء

ڈیئر [illegible] صاحب — علمائے مصر (جامعہ ازہر) کا جو وفد ہندوستان آیا تھا
[illegible] دہلی سے لاہور پہنچا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] Faletti's Hotel میں [illegible] ۲۶ اور ۲۸ تک
[illegible]

Egyptian Delegation
Faletti's Hotel, Lahore

[illegible]

محمد اقبال

شیخ اعجاز احمد

علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد بڑے مخلص اور پابندِ وضع بزرگ ہیں۔ علامہ مرحوم کی جو شفقت اور قرب انھیں حاصل رہا ہے، اُس کی بدولت اپنے خاندان، علامہ کی زندگی کے حالات اور ملفوظات و نوادر کا بڑا ذخیرہ اُن کے پاس سالہا سال سے محفوظ چلا آتا ہے۔

راقم الحروف تیرہ چودہ سال تک انھیں توجہ دلاتا رہا کہ یہ سرمایہ کتابی صورت میں قوم تک پہنچا دیا جائے، لیکن شیخ صاحب اس کام کے لیے موقع اور فرصت کے منتظر رہے۔ یہاں تک کہ میں نے جب "روزگارِ فقیر" کے نقشِ اوّل کی ترتیب کا آغاز کیا تو شیخ صاحب نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے تعاون سے نوازا اور جب جلد دوم مرتب ہونے لگی تو انھوں نے نہایت فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ احوال و وقائع کا تمام گرانقدر سرمایہ میرے سامنے رکھ دیا۔ اس علمی ذخیرے میں جابجا علامہ کی خود نوشت عبارتوں کے اقتباسات، بعض دستاویزات اور تمغوں (Medals) کے عکسی فوٹو نظر آئیں گے۔ ان نوادر کا ماخذ اور منبع شیخ صاحب

ہی کی ذات ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے کس قدر احتیاط اور عقیدت کے ساتھ اس خرمن کے ایک ایک خوشے کو محفوظ رکھا ہے۔

راقم الحروف نے اپنی استطاعت کی حد تک امکانی کوشش کی ہے کہ شیخ صاحب کی روایت، بیان اور یادداشت کی ترجمانی نفسِ مفہوم کے مطابق ہو سکے۔ جنابِ موصوف نے روایت و بیان میں بڑی احتیاط اور ذمہ داری کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان واقعات میں سے بعض کا مختصر تذکرہ جلدِ اول میں آچکا ہے۔ جلدِ دوم کے اوراق اُن کی ضروری تفصیلات و توجیہات سے آراستہ اور پیراستہ ہیں۔

آبا و اجداد

ڈاکٹر صاحب کے سوانحِ حیات اور حالاتِ زندگی کتابوں اور رسالوں کے مضامین میں آچکے ہیں۔ اُن میں اس کا بھی ذکر آیا ہے کہ اُن کے آبا و اجداد کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم سپرو خاندان سے تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خاندانی نسبت کو چھپایا نہیں ہے۔ شعروں میں اپنے "برہمن زادہ" ہونے کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بزرگوں کو ایک ولیِ عارف سے عقیدت تھی۔ یہی عقیدت اُن کے بزرگوں کے اسلام لانے کا سبب اور ذریعہ بن گئی۔ یہ اب سے ڈھائی سو سال پہلے کی بات ہے۔ جب اقبال کے گھرانے میں ایمان و اسلام کی روشنی نمودار ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے برادر زادے شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں کہ اُن کے دادا نے اپنے بزرگوں کی زبانی سُنا تھا کہ اُن کے آبا میں ایک بزرگ

نے اتنی مرتبہ پاپیادہ حج کیا کہ اُن کا لقب ہی "لولِ حج" پڑ گیا۔ اعجاز صاحب کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے خاندانی حالات کی جستجو کا بڑا شوق رکھتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے کشمیری تہذیب و تمدن پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ اس کتاب کے جانچنے والے تین علماء تھے؛ انگلستان اور آئرلینڈ کے دو پروفیسر اور تیسرے علامہ اقبال۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں رجسٹرار صاحب مذکور ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے لاہور آئے۔ انھوں نے اپنے کسی دوست کو ہدایت کی کہ خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر کا قلمی نسخہ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا دے۔ وہ صاحب یہ قلمی نسخہ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر انھیں دے گئے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت فارغ بیٹھے تھے۔ انھوں نے یہی کتاب دیکھنی شروع کر دی۔ دو چار ورق اُلٹنے کے بعد "بابا لول حج" کا تذکرہ مل گیا۔ اس تذکرے کے مطابق بابا لول حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اُن کی اصل سکونت موضع چکو پرگنہ آدون کی تھی۔ بیوی سے ان کے تعلقات خوش گوار نہ تھے، اس لیے ترکِ دنیا کر کے کشمیر ہی کو چھوڑ دیا اور بارہ سال ہجرت میں گزار دیے۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت سے ملکوں کی سیر و سیاحت کی۔ واپس آنے پر اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصیر الدین کے مرید ہوئے، جو حضرت شاہ نور الدین ولی سے بیعت تھے۔ عمر کا بقیہ حصہ

---

[1] حج کا عاشق۔

اُنھوں نے اپنے پیر و مرشد کی صحبت اور خدمت میں گزارا اور اپنے مرشد ہی کے جوار میں دفن ہوئے۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جذب و سوز ڈاکٹر اقبال کو ورثے میں ملا تھا اور اس "برہمن زادے" کے لیے "رمز آشنائے رُوم و تبریز" ہونا مقدر کر دیا گیا تھا۔

خاندانی حالات

علامہ اقبال کے آبا و اجداد میں کس نے اور کب کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی —— اس کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہر خاندان اور گھرانے کے واقعات کہاں قلمبند ہوتے ہیں۔ کسی خاندان میں کوئی بڑا آدمی پیدا ہو جاتا ہے تو پھر لوگ اس خاندان کے تاریخی حالات کی جستجو کرتے ہیں اور ماضی کی تاریخ پر گمنامی کا دُھندلکا پاتے ہیں۔ قرائن یہ ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ ہجرت ہوئی ہو گی اور ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جمال دین تھے یا اُن کے چار بیٹے جن کے نام شیخ عبدالرحمٰن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق اور شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ شیخ جمال دین نے اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر ترکِ وطن کیا ہو۔ بہر حال یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں سے علامہ اقبال کے دادا

شیخ محمد رفیق اور ان کے دو بھائی شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ محمد رمضان تو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور تیسرے بھائی شیخ عبداللہ موضع جیٹھی کے میں۔ ان چاروں بھائیوں کی اولاد آج تک شہر سیالکوٹ اور موضع جیٹھی کے میں آباد ہے۔

علامہ کے دادا کی پہلی شادی شہر سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی تھی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور وہ وفات پا گئیں۔ دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی۔ یہ بیوی بہت خوبصورت تھیں۔ اس لیے ان کا لقب "گوجری" پڑ گیا تھا۔ ان سے شیخ محمد رفیق کے اوپر تلے دس لڑکے ہوئے اور سب کے سب فوت ہو گئے۔ علامہ کے والد شیخ محمد رفیق کی گیارھویں اولاد تھے۔ اُن کی پیدائش پر گھر کی عورتوں نے بڑی منتیں مانیں۔ پیروں فقیروں سے دعائیں بھی کرائیں۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کسی نیک دل بزرگ کی دعا قبول ہوئی اور علامہ کے والد نہ صرف زندہ رہے بلکہ طویل عمر پائی۔ قمری حساب سے اُن کی عمر ۹۶ سال اور شمسی حساب سے ۹۳ سال کی ہوئی۔ انھوں نے اپنے قابلِ فخر بیٹے اقبال کی شہرت، عزت اور مقبولیت کی بہاریں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ علامہ کے والد کی پیدائش کے بعد اُن کے والدین کے یہاں ایک اور لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اُن کا نام غلام محمد تھا۔ وہ محکمہ نہر میں اوورسیئر تھے اور روپڑ ضلع انبالہ میں متعین تھے۔ شیخ محمد رفیق اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے روپڑ گئے ہوئے تھے کہ وہیں ہیضہ ہوا اور اسی مرض میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ روپڑ ہی میں وہ دفن ہوئے۔ شیخ غلام محمد نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ وفات کے وقت اُن کی دو لڑکیاں حیات تھیں، جن کی اولاد

شہر سیالکوٹ میں آج تک آباد ہے۔

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

لاہور سے شائع ہونے والے ایک انگریزی روزنامے نے حال ہی میں "اقبال کی ابتدائی زندگی پر نئی روشنی" کے جلی عنوان سے ایک مضمون شائع کیا ہے، جس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال کا اپنے آپ کو برہمن نژاد اور سپرو بیان کرنا درست معلوم نہیں ہوتا اور وہ دراصل "میر" تھے اور کشمیر کے "میر" مغل نسل سے ہیں۔ صاحب مضمون نے اپنی اس "تحقیق" کی بنیاد علامہ کی پہلی شادی کے نکاح نامے پر رکھی ہے جو انھیں علامہ کی پہلی بیگم کے میکے سے قرابت داری کی وجہ سے دستیاب ہوا ہے اور جس کا عکس بھی اس مضمون میں شائع کیا گیا ہے۔ اس نکاح نامے پر گواہانِ نکاح میں ایک صاحب "حاجی نور محمد ولد حاتم میر قوم کشمیری سکنہ سیالکوٹ" ہیں۔ صاحب مضمون نے پہلے تو بغیر کسی ثبوت کے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ گواہِ نکاح خود علامہ کے والد ہیں۔ پھر اس مفروضے سے علاوہ کئی اور غلط نتائج کے ایک یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ جب علامہ کے والد نے اپنی ولدیت "حاتم میر" لکھائی ہے تو علامہ کا اپنے آباؤ اجداد کو سپرو (کشمیری پنڈت) کہنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ

خشتِ اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا مے رود دیوار کج!

چونکہ صاحبِ مضمون نے "حاجی نور محمد" صاحب کے دستخط کو علامہ کے والد کے دستخط فرض کر لیا۔ حالانکہ وہ ان کے دستخط نہیں، لہٰذا اس مفروضے کی بنا پر جو نتائج انھوں نے نکالے، اُن کا غلط ہونا لازم تھا —— ایک "نئی بات" پیش کرنے کے شوق میں صاحبِ مضمون نے "کاتا اور لے دوڑی" والی بات کی ہے۔ ان کا ذہن اس طرف منتقل ہی نہیں ہوا کہ یہ "حاجی نور محمد" کوئی اور صاحب بھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی سیالکوٹ اور اس کے قرب و نواح میں علامہ کے والدِ گرامی اور ان کے خاندان کو اچھی طرح جاننے والے بہت سے افراد موجود ہیں اور اُن کے عزیز و اقارب بھی کافی تعداد میں ہیں۔ اگر اس تحقیق کے سلسلے میں تھوڑی سی زحمت گوارا کی جاتی اور علامہ کے قرابت دار یا ان کے والد اور خاندان کے جاننے والوں سے دریافت کر لیا جاتا تو صاحبِ مضمون کی غلط فہمی دور ہو جاتی۔ راقم الحروف نے علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے دریافت کیا ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ اُن کے دادا کے والد صاحب کا نام شیخ محمد رفیق تھا نہ کہ حاتم میر۔ نیز یہ کہ اُن کے دادا کو حج کی سعادت حاصل نہیں تھی اور وہ کبھی "حاجی نور محمد" نہیں کہلائے۔ گوجرانوالہ کے ایک صاحب نے، جو علامہ کے خاندان سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں، اسی انگریزی روزنامے میں ایک تردیدی مکتوب شائع کرایا ہے۔ شیخ اعجاز احمد نے مکتوب نگار کی تائید میں فرمایا ہے کہ "حاجی نور محمد ولد حاتم میر" اُن کے ایک قرابت دار بزرگ تھے، جن کے بھتیجے فضل دین میر صاحب

سے اُن کی ایک رشتے کی بہن (شیخ نور محمد کے بھائی کی نواسی) کی شادی ہوئی تھی۔ فضل دین میر صاحب ابھی تک زندہ ہیں اور وہ اور اُن کے خاندان کے افراد سیالکوٹ میں آباد ہیں۔

راقم الحروف نے اعجاز صاحب کے پاس رجسٹری شدہ دستاویزات دیکھی ہیں، جن میں شیخ نور محمد صاحب کی ولدیت شیخ محمد رفیق درج ہے۔ ان میں سے ایک دستاویز کا عکس، یہاں شائع کیا جا رہا ہے:—


6 Rs.

منشی محمد دین فوق کی تحقیق کے مطابق علامہ کے آباؤ اجداد برہمن تھے اور ان کی گوت "سپرو" تھی۔ اس کے علاوہ علامہ نے اپنے کلام میں خود بھی ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے آباؤ اجداد کے برہمن ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اعجاز صاحب کے پاس راقم الحروف نے ایک رجسٹری شدہ دستاویز علامہ کی اپنی قلمی بھی دیکھی ہے جس میں انھوں نے اپنی قومیت "سپرو" (کشمیری پنڈت) لکھی ہے۔ اس قلمی دستاویز کا عکس بھی ذیل میں شائع کیا جارہا ہے۔



صاحب مضمون نے اس پہلو پر غور نہیں فرمایا کہ آخر علامہ کو اپنی ذات غلط بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ وہ تو فرماتے ہیں کہ ـــــ

بُت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یادِ ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبالؔ
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

لہٰذا کیوں اُن کے اپنے بیان کو غلط سمجھا جائے اور مفروضات پر غلط روایات کو شہرت دی جائے ۔

علامہ اقبال چونکہ ایک قومی بلکہ بین الاقوامی شخصیت ہیں، اس لیے ہر ایک کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ اُن کے متعلق تحقیق کرے اور اپنی تحقیق کے نتائج قوم کے سامنے پیش کرے ۔ لیکن اس حق کو استعمال کرتے ہوئے تحقیق کا حق بھی پُوری طرح ادا کرنا چاہیے یعنی نتائج کی بنیاد ٹھوس واقعات پر رکھنی چاہیے نہ کہ صرف ذاتی مفروضات و قیاسات پر، کیونکہ ایسا نہ کرنے سے علامہؒ کے متعلق غلط روایات مشہور ہو جائیں گی اور یہ علامہ کے ساتھ اور خود اپنی قومی تاریخ کے ساتھ نا انصافی ہوگی ۔

مضمون زیر بحث میں صاحب مضمون نے علامہؒ کی تاریخ پیدائش کو جو "روزگار فقیر" میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بیان کی گئی ہے، درست تسلیم کیا ہے، مگر اُن کے خیال میں اس تاریخ کے "دریافت" کرنے میں جرمن مصنفہ مس این میری

شمل تسبقت لے گئی ہیں، کیونکہ بقول صاحب مضمون انھوں نے "روزگارِ فقیر" کی اشاعت سے قبل اپنی تصنیف Gabriel's Wing میں اس تاریخ کا ذکر کیا ہے۔

اس مضمون کی تردید میں گوجرانوالہ کے ایک صاحب کا جو مکتوب شائع ہوا ہے، اُس میں کہا گیا ہے کہ علامہ کی صحیح تاریخ پیدائش تو مس شمل اور مصنف "روزگارِ فقیر" سے بہت پہلے منشی محمد دین صاحب فوق "دریافت" فرما چکے تھے۔ لہٰذا اس "دریافت" کا سہرا دراصل اُن کے سر ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ مس شمل کی تصنیف "روزگارِ فقیر" سے قبل شائع بھی ہوئی یا نہیں۔ نہ ہی مکتوب نگار سے یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ فوق صاحب نے اپنی کس تصنیف میں علامہ کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بیان کی ہے۔ کیونکہ اُن کی تصنیف "مشاہیرِ کشمیر" میں تو علامہ کا سنِ پیدائش ۱۸۷۵ء اور اُن کے مضمون "اقبال کے مختصر سوانحِ حیات" مطبوعہ اقبال نمبر، نیرنگِ خیال میں ۱۸۷۶ء درج ہے۔

"روزگارِ فقیر" کے حصہ اوّل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ علامہ نے ۱۹۰۸ء میں اپنے تحقیقی مقالے "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" کے تعارفی نوٹ میں اپنی تاریخِ پیدائش ۳ ذی قعد ۱۲۹۴ھ بیان کی ہے جو سنِ عیسوی کے مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ بعد میں جس کسی نے بھی اپنی تصنیف میں یہ تاریخِ پیدائش بیان کی ہے۔ اُس نے علامہ کے ہی بیان پر انحصار کیا ہے۔

MURRAY COLLEGE
SIALKOT CITY.
(WEST PAKISTAN.)

29th April, 1963.

The entries of Dr Muhammad Iqbal (the renowned poet and Philosopher) as recorded in the College admission register are that he joined this College on 5th May, 1893 and that his age given is 18 years. (No definite dates of birth are given in the Register).

"روزگارِ فقیر" کی جلد اول میں علامہ اقبال کی تاریخ ولادت سے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اُس میں صفحہ ۲۲۳ پر مرے کالج سیالکوٹ میں اُن کے داخلے کی تاریخ ۵ مئی ۱۸۹۳ء بیان کی گئی ہے۔ لاہور کے انگریزی روزنامے میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اس تاریخ کی صحت پر شبے کا اظہار کیا گیا ہے۔ حالانکہ مصنّف "روزگارِ فقیر" نے دونوں جلدوں میں ایسی ایک بھی تاریخ بیان نہیں کی ہے جس کا باقاعدہ اور مستند حوالہ مصنّف کے پاس موجود نہ ہو۔

مندرجہ بالا تاریخ (۵ مئی ۱۸۹۳ء) بھی مرے کالج سیالکوٹ کے ایک خط سے اخذ کی گئی تھی جس کا عکس قارئین کی آگاہی کے لیے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(مؤلف "روزگارِ فقیر")

اس اعتبار سے یہ تاریخ نہ کسی مصنف کی "دریافت" ہے، نہ کسی کا انکشاف۔ راقم الحروف نے بھی اس تاریخ کو علامہ کی خود بیان کردہ تاریخ کے طور پر ہی پیش کیا ہے۔ البتہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تائید میں جو شہادتیں اور مستند حوالے مل سکے، اُن سب کو مرتب اور محفوظ کر دیا ہے تاکہ تاریخ پیدائش کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور علامہ کی تاریخ پیدائش وہی درست سمجھی جائے جو خود انھوں نے بیان فرمائی ہے۔

اقبال منزل

علامہ اقبال کے آبا و اجداد جب کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں وارد ہوئے تو اوّل اوّل اس شہر کے محلہ کھٹیکاں کے ایک مکان میں اقامت گزیں ہوئے۔ فروری ۱۸۶۱ء میں علامہ کے دادا شیخ محمد رفیق نے موجودہ جدی مکان جو اقبال منزل کے نام سے موسوم ہے خرید کیا۔ اس وقت وہ مکان ایک یک منزل حویلی کی صورت میں تھا۔ جس میں دو کوٹھڑیاں، ایک دالان، ایک ڈیوڑھی اور صحن تھا۔ دسمبر ۱۸۹۲ء میں اس مکان کا ملحقہ ایک دو منزلہ مکان جس میں اُس وقت اوپر نیچے دو کوٹھڑیاں، ایک دالان اور ایک باورچی خانہ تھا، علامہ کے والد نے خریدا۔ پھر کوئی دو ڈھائی سال بعد مارچ ۱۸۹۵ء میں دو دکانیں جو پہلے مکانات سے ملی ہوئی بازار کی طرف تھیں، خرید کی گئیں۔ ان تینوں قطعات، مکان و اراضی کو ملا کر موجودہ مکان تعمیر ہوا۔ جب شیخ اعجاز احمد کے والد یعنی علامہ اقبال کے بھائی پنشن لے کر سیالکوٹ

آ گئے، تو انھوں نے اِس مکان کو ازسرِ نو تعمیر کرایا، جو اب تک موجود ہے۔

علامہ اقبال کی پیدائش ۱۸۷۷ء کی ہے۔ اِس لیے وہ اُس مکان میں پیدا ہوئے جو ۱۸۶۱ء میں اُن کے جدِ بزرگوار نے خریدا تھا۔ یہ ایک منزلہ مکان تھا جس میں صرف دو کوٹھڑیاں اور ایک دالان تھا۔ لہٰذا علامہ اقبال کے کمرۂ ولادت کی جو تصویر ایک ذمہ دار ادارے کی مُرتّبہ کتاب میں شائع ہوئی ہے، وُہ دُرست نہیں ہے، کیونکہ یہ کمرہ جسے اِس تصویر میں علامہ اقبال کی ولادت گاہ بتایا گیا ہے، موجودہ اقبال منزل کی دُوسری منزل میں بازار کی طرف ہے۔ حالانکہ ۱۸۷۷ء تک یہ حصّہ مکان خریدا بھی نہیں گیا تھا — خاطر خواہ تحقیق نہ ہونے کے سبب مشاہیر کے بارے میں اسی طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں، بلکہ بعض غلط واقعات شہرت پا جاتے ہیں۔

میاں جی

شیخ صاحب راوی ہیں کہ اُن کے دادا جان یعنی علامہ کے والدِ بزرگوار کو گھر والے اور باہر والے سب "میاں جی" اور علامہ کی والدۂ محترمہ کو "بے جی" کہا کرتے تھے۔ میاں جی بلند قامت ہونے کے ساتھ وجیہہ صورت بھی تھے۔ بڑھاپے میں بھی اُن کا رنگ کندنی تھا۔ سفید ریش نے چہرے کو اور بھی نورانی بنا دیا تھا۔ میاں جی نے مرنجاں مرنج طبیعت اور صلح کل مزاج پایا تھا۔ ساتھ ہی عالی ظرف اور بردبار بھی تھے۔ اُن کی زندگی میں کتنے ہی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اپنے مخالفوں

اور ناحق ایذا پہنچانے والوں کو اُنھوں نے معاف کر دیا اور انتقام نہیں لیا۔ وہ بڑے اصول پسند اور طبیعت کے نیک اور سادہ تھے۔

علامہ کے والد ـــــ میاں جی ـــــ نے کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ بچپن میں وہ حرف شناس رہے ہوں گے، مگر ان کی ذہنی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اردو اور فارسی کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھ سکتے تھے۔ علامہ اقبال کی جو تصانیف میاں جی کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں، وہ اکثر اُن کے زیرِ مطالعہ رہتیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ تنہائی میں کلامِ اقبال اُونچی آواز میں پڑھ رہے ہیں اور روتے جاتے ہیں۔

میاں جی شاعر تو نہ تھے، مگر طبیعت موزوں پائی تھی۔ علامہ اقبال کی والدہ ـــــ یعنی بے جی ـــــ کی وفات کا انھیں بہت صدمہ ہُوا۔ ایک دن شیخ اعجاز احمد سے کاغذ اور قلم دوات لانے کے لیے کہا۔ وہ سمجھے کہ شاید علامہ کو خط لکھوائیں گے۔ فرمایا، جو کچھ مَیں بولتا جاؤں، اُسے لکھتے جاؤ، اور پھر میرے لکھوائے ہُوئے کاغذ کو اپنے چچا کے پاس بھیج دو۔ میاں جی سوچ سوچ کر شعر لکھواتے جاتے تھے۔ غالباً دو نشستوں میں انھوں نے دس بارہ شعر قلمبند کرائے۔ اُن میں کا کوئی مصرعہ بھی وزن سے خارج نہ تھا۔ اُن شعروں میں بس یہ ایک شعر شیخ صاحب کو یاد رہ گیا ہے ـــــ

یہ تنہا زندگی پیری میں نصف الموت ہوتی ہے
نہ کوئی ہم سخن اپنا نہ کوئی رازداں اپنا

یہ اشعار اعجاز صاحب نے علامہ کو بھیج دیے۔ اُنھوں نے کچھ عرصے بعد

اپنی نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" کاتب سے خوشخط لکھوا کر میاں جی کے لیے ارسال کر دی۔ میاں جی اس نظم کو اکثر پڑھا کرتے اور پڑھتے میں گریہ طاری ہو جاتا اور زار و قطار روتے جاتے۔

علامہ اقبال کی بہن بڑی عابدہ زاہدہ تھیں۔ خاص طور سے اولیاء اللہ کی کرامات اور خرقِ عادت کی کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتیں۔ انھوں نے ایک دن شیخ اعجاز احمد سے کہا کہ میاں جی کو "اسمِ اعظم" معلوم ہے، جسے وہ بھائی صاحب (علامہ اقبال) کو بتا چکے ہیں۔ علامہ لاہور سے سیالکوٹ تشریف لائے تو ایک روز اعجاز صاحب نے اُن کے پاؤں دباتے ہوئے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ میاں جی نے آپ کو "اسمِ اعظم" بتا دیا ہے۔ فرمایا "یہ بات تم میاں جی سے ہی پوچھنا۔ چنانچہ ایک دن اعجاز صاحب نے میاں جی سے اسمِ اعظم کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولے مجھے جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے جیسا کوئی اسمِ اعظم معلوم نہیں ہے کہ اس کے پڑھتے ہی کچھ سے کچھ ہو جائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ سے دُعا مشکلوں کو حل کرتی ہے۔ اس لیے دُعا ہی اسمِ اعظم ہے۔ پھر فرمایا "قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی اچھی صفات ہیں، جن کے ذریعے سے اُس سے دُعائیں کرنی چاہییں۔ مثلاً صحت کے لیے "یا شافی"۔ رزق کی کشائش کے لیے "یا رازق"۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دُوسرے صفاتی اسمائے حسنیٰ پکارنے سے مشکلیں حل ہوتی ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ الفاظ صرف زبان سے ہی نہیں، دل سے بھی نکلیں۔ اور دل اللہ تعالیٰ کی اس صفت پر یقین بھی رکھتا ہو۔ اس کے بعد کہا: "قبولیتِ دعا کا ایک نسخہ یاد رکھنے کے قابل

ہے۔ وہ یہ کہ ہر دعا سے قبل اور بعد حضورِ سرورِ کائنات پر درود بھیجیں۔ کیونکہ درود سے بڑھ کر اور کوئی "اسمِ اعظم" نہیں اور تمھارے چچا (اقبال) کو میں نے اسی "اسمِ اعظم" کی تلقین کی ہے۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ اسماءِ الٰہی میں "یا حی و یا قیوم" کا ورد بکثرت کرنا چاہیے۔ اقبال کو بھی میں نے اس کی تاکید کی ہے۔

اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ ـــــ

"چچا جان کی نظروں میں میاں جی کا مقام تو اس قطعۂ تاریخِ وفات سے ظاہر ہے جو ان کے لوحِ مزار پر کندہ کرایا گیا اور جس میں انھیں پدر و مرشدِ اقبال کہا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، میاں جی باقاعدہ بیعت لے کر کسی کو مرید نہیں بناتے تھے۔ اس لیے یہ روایت کہ چچا جان اپنے والد سے بیعت تھے، لفظاً تو نہیں، ہاں معنوی رنگ میں درست ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان کی نظر میں میاں جی کا وہی مرتبہ تھا جو ایک مرید کی نظر میں مرشد کا ہوتا ہے۔ میاں جی کی طبیعت ناساز ہونے کی خبر ملتی تو روزانہ کیفیت لکھنے کی مجھے تاکید فرماتے۔ فرصت نکال کر انھیں دیکھنے خود بھی آتے۔ ان کی دوا اور غذا کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی خبر رکھتے ـــــ

"کھانے کے لیے انھیں ساگودانہ بلکہ بہتر یہ ہے کہ
اراروٹ دیا جائے۔"

"بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ

کے انتظامِ خوراک وغیرہ کے متعلق لکھا تھا۔ یہ طریق بہت
اچھا ہے اور اسی کو دستور العمل بنایا جاوے۔"

"میں نے یورپ کے ایک مشہور حکیم کی کتاب میں
دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے، اُس کی عمر
بڑھتی ہے۔ تُرش لسی تو شاید آپ کے لیے مفید نہ ہو کہ آپ
کا گلا خراب ہے۔ البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی لی جاوے
تو شاید مفید ہو۔ اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔"

"ڈاکٹر عبداللطیف نے آپ کے دانت بنائے تھے۔
اگر وہ خراب ہو گئے ہوں تو اُن کو ڈاک میں بھیج دیجیے گا۔
پھر مرمت کرا دیے جائیں گے اور اگر وہ قابلِ مرمت بھی نہ
ہوں تو لکھیے، ڈاکٹر عبداللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ
وہاں جا کر آپ کے دانت بنا دے۔"

غرضیکہ چھوٹی چھوٹی بات کا خیال رکھتے تھے۔

۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔ ہماری ایک پھوپھی صاحبہ جو سیالکوٹ میں ہمارے
ساتھ رہتی تھیں اور جنھیں میاں جی کا قرب حاصل تھا، تھوڑے عرصے کے لیے
لاہور چچا جان کے ہاں گئیں۔ جب انھیں گئے کچھ دن ہو گئے تو میاں جی کچھ اداس
نظر آنے لگے۔ میں نے چچا جان کو یکے بعد دیگرے دو خط لکھے کہ میاں جی
بہت اداس معلوم ہوتے ہیں لہٰذا پھوپھی صاحبہ کو جلد ہی سیالکوٹ بھجوا دیں۔ میرے

خطوط ملنے پر انھوں نے میاں جی کو خط لکھا کہ آپ کی بے چینی کا حال معلوم ہو کر بہت رنج ہوا۔ ہمشیرہ کو ان شاء اللہ، اول تو آج ہی، ورنہ کل روانہ کر دیا جائے گا۔ اسی خط میں میرے نام بھی علیحدہ خط تھا، جو اس قابل ہے کہ اسے لفظ بلفظ نقل کر دیا جائے:

"برخوردار اعجاز کو بعد دعا واضح ہو کہ میں نے تمھارے دونوں خط پڑھ لیے ہیں۔ والد محترم کی طبیعت پہلے بھی رقیق تھی اب بہ سبب ضعفِ پیری کے اور بھی رقیق ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ عمر کا آدمی کوئی رفیق اپنا نہیں دیکھتا۔ اس کو دنیا نئی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے، جس سے اس کی طبیعت اور گھبرا جاتی ہے۔ اس واسطے میرا مشورہ تم کو یہ ہے کہ دن میں ایک دفعہ وقت نکال کے ایک آدھ گھنٹہ ان کے پاس بیٹھا کرو اور جن باتوں میں اُن کو دلچسپی ہے، ان کے متعلق ان سے گفتگو کیا کرو، خواہ وہ گفتگو بہ تکلف ہی کیوں نہ ہو۔ تم اس بات کو زندگی کے دیگر فرائض کی طرح لازم کر لو اور ایک دن بھی اس فرض کی انجام دہی سے غافل نہ ہو۔ غالب گمان ہے کہ اس سے تم کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ کیا عجب ہے کہ جو بات ان سے ..... کو حاصل نہیں ہو سکی، وہ تم کو مل جائے اور اگر یہ بات ہو گئی تو زندگی بھر اُن کے احسان کو فراموش

نہ کر سکو گے۔ اگرچہ اس وقت تم کو اس کا احساس نہ ہو کیونکہ جوانی کے خیالات کا رُخ اور طرف ہوتا ہے۔ مجھے خود جو فائدہ ان کی ذات سے ہوا، اس کا احساس اب ہوا ہے اور میں اس کو ہر قسم کے علم اور دنیوی وجاہت پر ترجیح دیتا ہوں۔ تم ان کے مذاق کا مطالعہ کرو اور پھر خواہ بہ تکلف ہی کیوں نہ ہو، تھوڑی دیر کے لیے اس مذاق میں رنگین ہو جایا کرو تاکہ وہ تمھیں محرم تصور کریں۔ اس میں تمھارے لیے بڑے بڑے فائدے مستور ہیں، جن کو میں اب بیان نہیں کر سکتا اور اگر بیان کروں بھی تو شاید تم ان کو اچھی طرح سمجھ بھی نہ سکو گے۔ اس فائدے کے علاوہ دنیوی فائدے کا بھی امکان غالب ہے۔ کسی وقت خوش ہو کر ایک کبیر السن آدمی کے منہ سے دُعا نکل جائے تو اسے دنیا کے تجربے نے نہایت پُر تاثیر بتایا ہے۔"

اس خط کے ملنے کے بعد جب تک میں سیالکوٹ میں رہا، قریباً ہر روز میاں جی کے پاس ضرور کچھ وقت بیٹھتا اور اُن کی باتوں سے مستفید ہوتا۔ اس سے مجھے اتنے فوائد حاصل ہوئے کہ میں نہ میاں جی کا احسان فراموش کر سکتا ہوں اور نہ چچا جان کا، جنھوں نے ایسی خدمت کی طرف توجہ دلائی۔

میاں جی کے ذکر میں ایک اور دلچسپ بات یاد آگئی ہے۔ میاں جی اکثر ململ کا کرتا پہنتے تھے۔ جان پہچان والے گھروں اور بعض اوقات

ایسے گھروں اور خاندانوں میں جن سے کوئی واقفیت نہ تھی، میاں جی کے استعمال کیے ہوئے کرتوں کی بڑی مانگ رہتی۔ یہ کرتا نومولود بچے کو پہنایا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں کا کہنا یہ تھا کہ اس کرتے کی برکت سے بچہ میاں جی کی طرح نیک، صاحب نصیب اور بڑی عمر والا ہوگا۔ خیر یہ تو اعتقاد کی بات تھی۔ جب کرتے کی مانگ آتی اور گھر کی کوئی خاتون میاں جی سے تذکرہ کرتیں تو میاں جی اس پر ہنس کر فرماتے ——

"اچھا، ایک شریک اور آگیا۔ اللھم زد فزد!"

یہ کہہ کر وہ اپنا کرتا دے دیتے۔

کیا عجب ہے کہ علامہ اقبال نے یہ شعر اپنے شفیق والد کو ذہن میں رکھ کر کہے ہوں جو "مردِ بزرگ" کے عنوان سے "ضربِ کلیم" میں شائع ہوئے ہیں ——

اُس کی نفرت بھی عمیق اُس کی محبت بھی عمیق!
قہر بھی اُس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اُس کو!
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق
اُس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا!
اُس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق!

بے جی

اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ ـــــ

میاں جی کی شادی موضع سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ان کے سسرال والے بھی سیالکوٹ میں ہی آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ دادی جی کو سب "بے جی" کہتے تھے۔ اُن کے ایک ہی بھائی تھے وہ کشمیری لوئیاں اور دُھسّے مختلف شہروں میں لے جاکر فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس سلسلے میں گئے تو پھر واپس نہ آئے۔ نہ ہی اُن کے متعلق کوئی خبر آئی بے جی کو عمر بھر بھائی کا غم رہا۔

بے جی لکھنا پڑھنا بالکل نہ جانتی تھیں۔ صرف نماز آتی تھی جو باقاعدہ پڑھا کرتی تھیں۔ ناخواندہ ہونے کے باوجود بڑی زیرک، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں۔ گھرداری کا سب انتظام وہ خود کرتی تھیں۔ میاں جی کبھی اس انتظام میں دخل نہ دیتے تھے۔ اپنے حسن سلوک سے محلّے اور برادری کی مستورات میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ برادری کے گھرانوں کے اکثر جھگڑے فیصلے کے لیے اُن کے پاس لائے جاتے اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے صلح صفائی کرا دیتیں۔ اکثر مستورات اُن کے پاس زیور نقدی امانت رکھوا جاتیں، جن کو وہ علیحدہ علیحدہ سُرخ رنگ کے کپڑے کی پوٹلیوں میں باندھ کر رکھا کرتیں۔

اُن کے جذبۂ ایثار کا ایک واقعہ بیان کر دیتا ہوں۔ میاں جی کے چھوٹے

بھائی غلام محمد صاحب کے ہاں لڑکیاں ہی ہوتی تھیں۔ اُن کی اہلیہ کو لڑکے کی خواہش تھی اور اس لیے بہت دل گیر رہتی تھیں۔ دونوں بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں بھائیوں کی بیویاں اُمّید سے ہُوئیں۔ اس مرتبہ بھی بے جی کو اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا کیا اور دیور کی بیوی کے پھر لڑکی پیدا ہُوئی۔ اُن کے غم و اندوہ کو دیکھتے ہُوئے بے جی نے اُن سے کہا کہ لڑکا تم لے لو اور لڑکی مجھے دے دو۔ چنانچہ بچوں کا تبادلہ ہوگیا، اور بے جی نے لڑکی کو پالنا شروع کر دیا اور اُن کی دیورانی نے لڑکے کو۔ کچھ مہینوں کے بعد ایک دن صبح کے وقت دونوں بیدار ہو کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئیں۔ بے جی نے لڑکے کے متعلق دریافت کیا تو اُن کی دیورانی نے کہا کہ ابھی دُودھ پی کر سو گیا ہے۔ جب کافی دیر ہوگئی اور لڑکا بیدار نہ ہُوا تو جا کر دیکھنے پر معلوم ہُوا کہ فوت ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہونٹوں پر دُودھ لگا ہُوا تھا۔ بے جی نے پھر وہ لڑکی اپنی دیورانی کو دے دی۔

یہ فوت ہونے والا لڑکا وہی تھا، جس کی پیدائش کے اندراج رجسٹر میونسپل کمیٹی کو غلطی سے چچا جان کی پیدائش کا اندراج (۱۸۷۳ء) سمجھ لیا گیا ہے۔ چچا جان کی پیدائش اس لڑکے کی پیدائش کے قریباً ۵ سال بعد ہُوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو بے جی کا یہ ایثار اتنا پسند آیا کہ فوت ہونے والے لڑکے کا نعم البدل علامہ اقبال ایسا فرزند عطا فرمایا۔

بے جی نے غربت کے دن بھی دیکھے تھے، اس لیے حتی المقدور غُربا کی امداد پر ہمیشہ آمادہ رہتیں۔ یہ ان کا نمایاں وصف تھا۔ کئی مستورات کو خفیہ طور پر

نقدی دیتی رہتیں۔ دینے اور لینے والے کے علاوہ کسی کو علم نہ تھا کہ کس کو' اور کیا دیتی ہیں۔ میرے آباجی مذاق میں ایسی امداد کو "گپت دان" کہا کرتے تھے۔ رخصت پر گھر آتے تو "گپت دان" کے پیسے بےجی کو علیحدہ رقم دیا کرتے تھے۔

بےجی کے امداد کرنے کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ محلے برادری کے غریب' مگر شریف گھرانوں کی دس بارہ سال کی عمر کی تین چار لڑکیاں اپنے گھر لے آتیں اور اُن کی کفیل ہو جاتیں۔ یہ لڑکیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بھی بٹاتیں اور ہماری مستورات سے قرآنِ کریم' نماز اور معمولی دینی تعلیم' اردو پڑھنا لکھنا' کھانا پکانا' سینا پرونا سیکھتیں تین چار سال بعد مناسب رشتہ تلاش کرکے اُن کی شادی کر دی جاتی۔ جتنا عرصہ وہ ہمارے ہاں رہتیں' اُن کی غور و پرداخت بالکل ایسے ہی کرتیں' جیسے گھر کی بیٹیوں کی اور شادی کے وقت بھی انھیں بیٹیوں کی طرح ہی رخصت کرتیں۔ شادی کے بعد بھی وہ لڑکیاں ہمارے ہاں اسی طرح آتیں' جس طرح لڑکیاں میکے آتی ہیں۔ اگرچہ ان لڑکیوں میں زیادہ تعداد محلے برادری کی لڑکیوں کی ہوتی' لیکن غیر برادری کے لوگ بھی اس سلوک سے مستثنیٰ نہ تھے۔ نواحی گاؤں کا ایک شخص بابا بوٹا ہمارے مکان کے سامنے سالہاسال سبزی فروخت کرتا رہا۔ جب اُس کی بیوی فوت ہو گئی اور اپنے پیچھے ایک کمسن لڑکی چھوڑ گئی تو بےجی اُس کو بھی گھر لے آئی تھیں' اور جوان ہونے پر وہ ہمارے ہی گھر سے اپنی برادری میں بیاہی گئی تھی۔ ایک لڑکی کو بےجی نے سردار چچی (والدہ جاوید) کے سپرد بھی کیا تھا۔ وہ لڑکی چچا جان کے ہاں لاہور میں پرورش پاتی رہی اور سردار چچی نے ہی اُس کی شادی کی تھی۔ ان لڑکیوں میں سے کچھ تو اب

فوت ہو چکی ہیں، کچھ اپنے گھروں میں خوشحال زندگی بسر کر رہی ہیں۔ دو ایک کے لڑکے اب بڑے اچھے عہدوں پر ہیں۔

"والدۂ مرحومہ کی یاد میں" جس صحبتِ مادر میں طفل سادہ رہ جانے کا ذکر ہے، وہ صحبتیں میری آنکھوں دیکھی ہیں۔ چچا جان عدالتوں کی چھٹیوں میں سیالکوٹ آتے تو دوپہر کے کھانے کے بعد یا پہلے روزانہ محفل جمتی، جس میں بے جی، میری پھوپھیاں، میری والدہ اور دونوں چچیاں شامل ہوتیں۔ چچا جان پلنگ پر لیٹے ہوتے اور مستورات تخت کے فرش پر ارد گرد بیٹھ جاتیں۔ علمی گفتگو کا تو اُس محفل میں کیا ذکر۔ بس اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں۔ محلے بھر کے قصے۔ برادری کے قصے۔ چچا جان کو ان قصوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ لیکن بڑے شوق سے سنتے۔ ایک مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیلتی رہتی۔ بعض اوقات خود پوچھتے۔ اچھا، بے جی! پھر فلاں ساس بہو کی لڑائی میں آپ نے کیسے صلح کرائی۔ رات کے کھانے کے بعد جو مجلس میاں جی سے ہوتی، اُس میں البتہ گفتگو زیادہ تر علمی رنگ کی ہوتی۔ بے جی کی وفات کے بعد بھی جب چچا جان سیالکوٹ آتے تو حسبِ دستور محفل جمتی، لیکن وہ بات پیدا نہ ہوتی جو بے جی کی موجودگی میں ہوتی تھی۔

بے جی کی وفات کا چچا جان کو سخت صدمہ ہوا تھا۔ مہینوں بُجھے دل گرفتہ رہے۔ ان کی یاد میں ایک بے مثل نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" لکھی۔ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اُس نظم کو خوش نویس سے لکھوا کر میاں جی کے لیے سیالکوٹ بھیجا۔ اس نظم کے سلسلے میں دو ایک باتوں کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

نظم سیالکوٹ بھیجنے کے بعد چچا جان سیالکوٹ آئے ہوئے تھے کہ منڈی بہاء الدین سے شائع ہونے والا ماہوار رسالہ "صوفی" ڈاک میں اُن کے نام آیا جس میں یہ پوری نظم چھپی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر چچا جان کو ضرور یہ خیال آیا ہو گا کہ یہ میری حرکت ہے، کیونکہ انھوں نے یہ نظم اشاعت کے لیے نہ رسالہ "صوفی" کو دی تھی نہ کسی اور کو۔ چنانچہ مجھے بلا کر دریافت فرمایا کہ نظم کی نقل یا میرے پاس ہے یا یہاں سیالکوٹ میں ہے۔ یہ "صوفی" میں کیسے شائع ہو گئی۔ چونکہ نظم میں نے اشاعت کے لیے نہیں دی تھی، اس لیے میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چچا جان بظاہر تو خاموش ہو گئے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے میرے انکار کو دل میں صحیح نہیں سمجھا۔ مجھ سے قلم دوات منگوا کر رسالہ "صوفی" والوں کے نام نوٹس تحریر کیا کہ اُن کی نظم بغیر ان کی اجازت کے کیوں شائع کی گئی۔ اور خط مجھے دیا کہ رجسٹری کرا دو۔ چنانچہ میں خط کو ڈاک خانے میں رجسٹری کرا آیا۔ دل میں سخت پریشان تھا کہ اگرچہ ناکردہ گناہ ہوں، لیکن چچا جان ضرور مجھے ہی مجرم سمجھے ہوئے ہیں۔ اسی پریشانی میں "صوفی" میں شائع شدہ نظم کو پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے محسوس کیا کہ کچھ اشعار اس نظم کے غیر مانوس سے ہیں۔ میں نے گھر میں جو نظم تھی، اُس کا مقابلہ "صوفی" میں چھپی ہوئی نظم سے کیا تو ایک دو نہیں، بلکہ نو اشعار ایسے ملے جو چچا جان کی ارسال کردہ نظم میں نہ تھے۔ یہ انکشاف میرے لیے بڑی ہی خوشی کا باعث ہوا، کیونکہ میری بریت کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "صوفی" میں شائع ہونے والی نظم میں ۹ اشعار ایسے ہیں جو اس نظم میں نہیں جو ہمارے

پاس ہے۔ وہ بہت متعجب ہوئے اور فرمایا، پھر تو نظم کسی طرح میرے ہاں سے اڑائی گئی ہے۔ سنا ہے "صوفی" والوں نے بعد میں منت سماجت کر کے چچا جان کو درگزر کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

خوشنویس کی لکھی ہوئی یہ نظم ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس میں گیارہ بند ہیں، جن کے ۸۹ اشعار ہیں۔ جب یہ نظم "بانگِ درا" میں شائع کی گئی تو ۸۹ اشعار میں سے ۸ اشعار ترک کر دیے گئے اور پانچ اشعار اُن نو اشعار میں سے جو میرے پاس والی نظم میں نہیں، ایزاد کیے گئے۔ گویا بانگِ درا میں ۸۶ اشعار شائع ہوئے اور ۱۲ اشعار ترک کر دیے گئے، نیز بندوں کی ترتیب میں بھی تبدیلی کی گئی۔ اِن ۱۲ اشعار میں سے ۱۱ اشعار "سرودِ رفتہ" میں شائع ہو گئے ہیں۔

جو نظم چچا جان نے میاں جی کے لیے سیالکوٹ بھجوائی، اُس کے آخری دو صفحوں پر اُن کے قلم سے ہر بند کا مختصر مفہوم نثر میں لکھا ہوا ہے۔ اس کا یہاں نقل کر دینا دلچسپی کا باعث ہوگا:[1]

بند اوّل و دوم

("بانگِ درا" میں شائع شدہ نظم کے پہلے ۷ اشعار اور ۲ ترک شدہ اشعار)

نظامِ عالم کے قوانین اٹل ہیں۔ قوانینِ فطرت کی محکم

---

[1] علامہ کی اس نادر تحریر کا عکس آئندہ صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (مؤلف)

زنجیر میں ہر شے جکڑی ہوئی اور مجبور ہے۔ اس واسطے جب انسان
کو اس عالمگیر مجبوری کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے مصائب پر
نالاں نہیں ہوتا۔ بلکہ آنسوؤں کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ عالم
کا دل گویا الماس کا ٹکڑا ہے، جس میں علم کی روشنی تو ہے، مگر
ساتھ ہی اُس کے سختی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور سوز و گداز رخصت
ہو جاتا ہے۔

بند سوم
("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۸ تا ۱۱)

شاعر اگرچہ حکمت سے متاثر ہونے کے باعث رونے
سے قاصر ہے تاہم محض تصویر کا نظارہ اُس کے خوابیدہ
تاثرات کو جگا دیتا ہے۔

بندِ چہارم
("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۱۲ تا ۲۰)

تاثر کی فضیلت عقل پر۔ ماں کی تصویر ایامِ طفلی کی
یاد دلاتی ہے۔

بندِ پنجم
("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۲۱ تا ۲۹ و تین اشعار ترک شدہ)

ماں کے احسانوں کو یاد کر کے روتا ہے۔

بندِ ششم

("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۳۰ تا ۴۱)

دُنیا میں موت کی عمومیت اور کثرت۔ ہر جگہ اُس کی حکمرانی ہے۔ کوئی مقام ایسا نہیں، جہاں یہ انسانی تمناؤں کا خون نہ کرتی ہو۔ مگر یہ دُنیا، جہاں موت کی اتنی کثرت ہے محض امتحان گاہ ہے اور کبھی نہ کبھی یہ امتحان ضرور ختم ہو جائے گا۔

بندِ ہفتم

("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۴۲ تا ۵۰ و دو ترک شدہ شعر)

زندگی کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور خود موت کی کثرت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی کو فنا نہیں ہے۔ قدرت اگر پیکرِ انسانی کو توڑ دیتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ قدرت ظالم ہے، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ قدرت کو اس بات پر کامل اعتماد ہے کہ وہ ہزاروں اچھے سے اچھے پیکر اور جسم بنا سکتی ہے۔ اس بات کو ہوا اور بلبلے کی مثال سے واضح کیا ہے۔

بندِ ہشتم

("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۵۱ تا ۵۶ اور ایک شعر ترک شدہ)

رات کے تارے جو اپنی چمک دمک کے لیے تاریکی

کے محتاج ہیں اور جو محض روشنی کی چنگاریاں ہیں۔ اُن کی عمر اس قدر لمبی ہے کہ انسانی عقل اُس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔ پھر انسان جو قدرت کا روشن ترین ستارہ ہے کیا ایک عارضی زندگی رکھتا ہے اور روشنی کی آسمانی چنگاریوں سے بھی گیا گزرا ہے؟ نہیں، اس کی عمر ستاروں کی عمر سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ ایک نہ بجھنے والا چراغ ہے۔

بندِ نہم

("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۵۷ تا ۶۳)

پھول کے بیج کی مثال سے قبر سے دوبارہ اُٹھنے کو واضح کرتا ہے اور اس کے امکان پر استدلال کرتا ہے۔

بندِ دہم

("بانگِ درا" کی نظم کے اشعار ۶۴ تا ۷۲)

آدمی اگر کچھ وقت کے بعد اپنے مصائب اور غم کو بھول جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وقت میں کوئی پوشیدہ قوت ہے، جس سے وہ انسانی غموں کو پرانا کر کے فنا کر دیتا ہے۔ ہم جو مرنے والوں کو فراموش کر دیتے ہیں تو یہ فراموشی وقت کے گزر جانے کا اثر نہیں، بلکہ ہماری فطرت میں ایک احساس مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا۔ یہی

لطیف احساس کی وجہ سے ہمارا غم دُور ہو جاتا ہے۔ پس گزرے ہُوئے عزیزوں کی طرف سے بے پروائی اور گونہ غفلت رُوح کے اس مخفی احساس کی وجہ سے ہے کہ ہمارے عزیز زندہ موجود ہیں۔ اگر وہ حقیقت میں فنا ہو چکے ہوتے تو یقیناً ہمارا غم کبھی ختم نہ ہوتا۔ گویا اس بند میں اور اس سے پہلے کے بند میں چار باتوں سے حیات مابعد الموت کا استدلال کیا ہے۔

(۱) موت کی عمومیت اور کثرت سے۔

(۲) رات کے آثار سے۔

(۳) پھُول کے بیج سے۔

(۴) انسان کی ظاہری فراموشی سے جو عام لوگوں کے نزدیک مُرورِ زمانہ سے پیدا ہوتی ہے۔

بند یازدہم

(بانگِ درا کی نظم کے اشعار ۷۸ تا ۸۹)

عام فلسفۂ حیات اور اشعارِ ذعائیہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر

اپنی نادانی میں انساں کی تگِ بیہودہ ہے

اپنے والد کی خدمت میں ارسال کی ہوئی علامہ کی نظم کا صفحۂ اول

علامہ کی خود نوشت تشریح کا عکس

۲،۱ بند اول و دوم — [illegible]

۳ بند سوم — [illegible]

۴ بند چہارم — [illegible]

۵ بند پنجم — [illegible]

۶ بند ششم — [illegible]

۷ بند ہفتم — [illegible]

۸ بند ہشتم — [illegible]

۹ بند نہم — [illegible]

۱۱ پنجم ۔ آدمی اگر [illegible] ۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

۱۔ [illegible]
۲۔ [illegible]
۳۔ [illegible]
۴۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] حکم اعلیٰ

مولانا میر حسن

"روزگارِ فقیر" کے پہلے حصے میں علامہ اقبال کے استاد مولانا سید میر حسن کے کچھ حالات آ چکے ہیں۔ شیخ اعجاز احمد، جن کو خود مولینا کی شاگردی کا فخر حاصل رہا ہے، اور جن سے انھوں نے فارسی پڑھی ہے، مزید حالات بیان کرتے ہیں۔

مولانا میر حسن ۸ اپریل ۱۸۴۴ء (مطابق ربیع الاول ۱۲۵۸ھ) کو موضع فیروز والا ضلع گوجرانوالہ میں، جہاں اُن کا ننھیال تھا، پیدا ہوئے۔ اُن کا تاریخی نام رونق بخش (۱۲۵۸ھ) تھا۔ شہر بھر میں وہ "شاہ صاحب" کے لقب سے مشہور تھے۔ انھوں نے قرآن شریف کی تعلیم اپنے والد سید محمد شاہ صاحب سے حاصل کی اور ابتدائی دو چار کتابیں مولانا شیر محمد صاحب سے پڑھیں۔ شیر محمد صاحب پسرور ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور شہر کے بازار دو دروازہ کی مسجد کلاں میں امامت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا میر حسن نے کسی اور اُستاد سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی اور جو کچھ علم حاصل کیا، اپنی ذاتی محنت اور مطالعے سے حاصل کیا۔ شاہ صاحب علم کا سمندر تھے۔ اتنا علم حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے کس قدر جانفشانی اور محنت و کاوش کی ہو گی، ہمارے اِس دورِ سہل پسندی میں اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

شاہ صاحب کو دُوسروں کی تعلیم و تربیت کا زندگی بھر کس قدر شوق رہا۔ اس کا اندازہ اس دلچسپ واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وزیر آباد اسکول کا ایک طالب علم حاکم رائے اکثر غیر حاضر رہتا تھا۔ شاہ صاحب نے سبب معلوم کیا تو پتہ چلا

کرتا کا پڑھنے سے جی چُراتا ہے اور کھیل کُود کا بہت شوقین ہے شاہ صاحب اس لڑکے کے پاس گئے تو دیکھا کہ اُبلے ہوئے چنوں کا خوانچہ لگائے بیٹھا ہے۔ سکول نہ آنے کا سبب پُوچھا تو دل گرفتہ انداز میں بولا۔ ہمارا اُستاد بڑا ظالم ہے۔ بات بات پر بے تحاشا پیٹتا ہے۔ شاہ صاحب نے شفقت سے کہا۔ میں نیا اُستاد ہو کر اس اسکول میں آیا ہوں۔ پڑھاتا ہوں۔ مارتا پیٹتا نہیں۔ تم اب ضرور اسکول آیا کرو۔ حاکم رائے نے بات مان لی اور پھر اسی طرح اسکول آنا شروع کر دیا ـــــ تعلیم مکمل ہونے پر محکمہ ڈاک میں ملازمت کی اور یہی حاکم رائے دو بار سیالکوٹ میں پوسٹ ماسٹر ہو کر آئے۔ شاگرد حاکم رائے کے دل میں اپنے اُستاد مولوی میر حسن کی اس قدر عزت تھی کہ جب کبھی اُستاد سے ملنے آتے تو جُوتے دروازے پر اُتار دیتے اور اُستاد کے بیٹھنے کی جگہ سے ننگے پاؤں واپس جاتے۔

اس چھوٹی سی مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شفیق اور لائق اُستاد کس طرح شاگردوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں اور اُنھیں مایوسی اور ناکامی کے ویرانوں سے نکال کر کامیابی کی منزلوں تک لے جاتے ہیں۔

۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو شاہ صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ علامہ اقبال نے اپنے شفیق اُستاد کی وفات کا بہت اثر لیا۔ مولوی میر حسن علامہ کے والد کے دیرینہ دوست تھے۔ اُنھیں بھی اپنے دوست کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ اس سانحے کے بعد ہفتوں افسردہ و غمگین رہے۔ کئی بار فرمایا ـــــ

"اب میرا وقت بھی قریب ہے۔"

چنانچہ اُن کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہُوا۔ مولانا میر حسن کی وفات کو پُورا ایک سال بھی نہ ہُوا تھا کہ علامہ کے والد شیخ نُور محمد اپنے دوست مولانا میر حسن سے جا ملے۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون!

درخواست یا انصاف کا مطالبہ

بعض اوقات تذکروں اور سوانح عمریوں میں کسی واقعے کا ذکر اس قدر اجمال و اختصار کے ساتھ مبہم پیرایے میں کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے اس واقعے سے کوئی اچھا اثر قبول نہیں کرتے اور ایک سادہ سی بات غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہے۔ بزمِ اقبال، لاہور کی مطبوعہ کتاب "ذکرِ اقبال" میں علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پر ۱۹۰۳ء میں ایک فوجداری مقدمہ دائر ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اُس کا یہی حال ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے ——

"..... آخر بڑی جدوجہد اور لارڈ کرزن سے اقبال کی ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہُوا۔"

ان الفاظ سے قاری کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے بڑے بھائی کو فوجداری مقدمے سے بچانے کی خاطر لارڈ کرزن، افسرِ اعلےٰ ہند سے سفارش کر کے اس قضیے کو ختم کرایا۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ شیخ عطا محمد جو بلوچستان میں اوورسیئر تھے اور فنِ تعمیر میں خاص مہارت رکھتے تھے، ایک سازش کا شکار ہو گئے۔ اُن کے دو غیر مسلم ساتھیوں نے انگریز افسر

سے مل کر شیخ صاحب کے خلاف سازش کی۔ یہاں تک کہ اُن کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ کھڑا کر دیا۔

شیخ صاحب کو اندیشہ تھا کہ اُن کے مخالف افسر عدالت اور گواہوں کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے شیخ صاحب نے اس بات کی تگ و دو کی کہ یا تو مقدمہ کسی دُوسرے ضلع کی عدالت میں منتقل ہو جائے یا اُن ایک دو عہدیداروں کا تبادلہ کر دیا جائے، مگر بلوچستان پولیٹیکل ایجنسی کے کرتا دھرتا اِن دو باتوں میں سے کسی بات پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبور ہو کر علامہ اقبال نے وائسرائے ہند کو تمام حالات سے مُطلع کیا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ اقبال کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ سرکاری حلقوں میں نہ تو اُن کی رسائی تھی اور نہ کوئی اثر و رسوخ تھا۔ اُن کی شاعرانہ شہرت پر ابھی شباب کہاں آیا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وائسرائے ہند نے انگریزی انصاف کی ساکھ باقی رکھنے کے لیے واقعات کی تحقیق کرائی ہوگی اور اطمینان ہو جانے کے بعد ان افسروں کا، جن کی شیخ صاحب سے جھڑپ اور بدمزگی ہو گئی تھی، تبادلہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ مقدمہ بھی بے جان اور کمزور ہو گیا۔

علامہ اقبال نے ۹ر اگست ۱۹۰۳ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر کو جو خط لکھا ہے اُس میں اِس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے ——

"... میرے بڑے بھائی جان بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل افسر ملٹری ورکس تھے۔ اُن کے مخالفین نے ایک

خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا تھا، لیکن الحمد للہ کہ دشمنوں کے مُنہ میں خاک پڑی .... بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ ناانصافی کرنے پر آمادہ تھے، مگر خدا لارڈ کرزن کا بھلا کرے کہ میرے لکھنے پر معاملہ دگرگوں ہو گیا۔"

علامہ اقبال کی دُعائیہ نظم "برگِ گل" کے اِس شعر میں ــــــ

کیا کہوں اوروں کا شکوہ لے امیرِ مُلکِ فقر!
دشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن اغیار سے

دشمنوں کی اِسی سازش کی طرف اشارہ ہے، جس میں علامہ کے بڑے بھائی کے خلاف محکمے کے دو غیر مُسلم عہدے دار خاص طور سے شریک تھے۔

یہ نظم علامہ اقبال نے اِسی اضطراب کے عالم میں کہی تھی، اللہ تعالیٰ نے اُن کی دُعا سُن لی شیخ عطا محمد باعزت طور پر بری ہو گئے۔ عدالت کے فیصلہ برّیت کے علاوہ محکمے نے اُن کی سروس بُک میں یہ ریمارک دیا ــــــ

Not Guilty

Free of Suspicion

شیخ اعجاز احمد جو اِس پُورے واقعے کے راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ اُن کی پھوپھی صاحبہ نے بیان کیا کہ اِسی مقدمے کے بعد علامہ اقبال نے بیرسٹری پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

انگلستان سے واپسی

علامہ اقبال ۱۹۰۸ء میں جب انگلستان سے واپس تشریف لائے تو سیالکوٹ ریلوے اسٹیشن پر شہر کے لوگوں نے اُن کا بڑے جوش و محبت کے ساتھ استقبال کیا۔ آغا باقر خاں صاحب مرحوم جو آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اور شہر کے رؤسا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے اس خیر مقدم کا انتظام و اہتمام بڑے سلیقے کے ساتھ کیا۔ علامہ مرحوم کی یہ غزل ——

دلہن کے زیبِ بدن خوشبوئے کسی کی جھولی ہے

جس کا مقطع ہے ——

گلِ مضموں سے اے اقبالؔ یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل میری غزل کیا ہے کسی گلچیں کی جھولی ہے

اس میں جس ناصر کے سہرے کا ذکر ہے، وہ انھی آغا صاحب کے فرزند تھے۔

شیخ اعجاز احمد جنھوں نے اس استقبال کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بیان کرتے ہیں کہ پلیٹ فارم استقبال کرنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پھولوں کے ہار اتنی کثیر تعداد میں پہنائے گئے کہ علامہ کا چہرہ پھولوں میں چھپ گیا۔ علامہ کو ٹاؤن ہال میں شہریوں کی طرف سے ایک استقبالیہ بھی دیا گیا ——

سیالکوٹ میں ایک صاحب منشی میراں بخش تھے۔ اُن کا تخلص جلوہ تھا۔ عدالت میں اپیل نویس تھے۔ یہ بزرگ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں نظمیں بھی پڑھا

کرتے تھے۔ انھوں نے اس استقبالیے میں خوش آمدید کی نظم پڑھی، جس کا ایک شعر تھا ــــ

مُبارک ڈاکٹر اقبال انگلستان سے آیا!
دُو پی ایچ ڈی اور ایل ایل ڈی کی ڈگری ساتھ لایا

علامہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تو ضرور لائے تھے، لیکن "ایل ایل ڈی" کی ڈگری جلوہ صاحب نے ضرورتِ شعری کے لیے اپنے پاس سے عطا کر دی ــــ

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے

گدائے دردمند

مثنوی "رموزِ بے خودی" میں علامہ نے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک سائل بھیک مانگتا اور صدا لگاتا ہوا اُن کے دروازے پر آیا۔ یہ گدا مبرم یعنی اڑیل فقیر تھا۔ دروازے سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اُس کے بار بار چیخ چیخ کر صدا لگانے پر علامہ اقبال نے طیش میں آکر اُسے مارا اور اس مار پیٹ میں فقیر کی جھولی میں جو کچھ تھا، زمین پر گر گیا۔ علامہ کے والد اس حرکت پر بہت آزردہ اور کبیدہ خاطر ہوئے اور دل گرفتہ ہو کر بیٹے سے کہا کہ قیامت کے دن جب خیر الرسلؐ کی اُمت سرکار کے حضور جمع ہو گی تو یہ گدائے دردمند تمھارے اس برتاؤ کے خلاف حضور رسالت مآب سے فریاد کرے گا۔ اُس وقت ـــ

اے صراحت مشکل از بے مرکبی
من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ!
"حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد!
از تو ایں یک کار آساں ہم نہ شد
یعنی آں انبارِ گل آدم نہ شد"
در ملامت نرم گفتار آں کریم
من رہینِ خجلت و امید و بیم
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر!
اجتماعِ امتِ خیر البشرؐ
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر!
لرزہ بیم و امیدِ من نگر!
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

یہ شاعرانہ پیرایۂ بیان یا خیالی حکایت نہیں ہے بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔ علامہ مرحوم کے والد کو اپنے بیٹے کی تربیت کا بڑا خیال رہتا۔ وہ کسی بات پر ٹوکتے یا اس کے کرنے سے منع کرتے تو اکثر بحیثیت قرآنِ کریم یا اسوۂ رسولِ کریمؐ کے سند وحوالہ سے پند و نصیحت فرماتے۔ علامہ اقبال قرآن کی آیت اور حدیثِ رسولؐ سنتے

بنی گردن بر طاعت نہادن" کی تصویر بن جاتے ۔ ذرہ برابر چون و چرا نہیں اور نہ چہرے سے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار! مثال کے طور پر اعجاز صاحب کا بیان کردہ ایک واقعہ درجِ ذیل ہے :—

احترامِ قرآن

علامہ کی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی وزیر آباد کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی ۔ غالباً اس لیے کہ اُن کے یہاں شادی کے بعد ایک دو سال میں کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ اُن کی خوش دامن نے سسرال میں انھیں رہنے نہ دیا ۔ تلخی اتنی بڑھی اور بات یہاں تک پہنچی کہ وہ مجبوراً میکے چلی آئیں اور کئی سال وہیں رہیں ۔ اُن کی ساس نے بیٹے کی دوسری شادی کر دی ۔ پھر نہ معلوم کیا واقعات پیش آئے کہ وہ اپنی اس دوسری بہو پر بھی سوکن لے آئیں ۔ علامہ کے بہنوئی ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اپنی والدہ کی زندگی بھر اُن کی خدمت اور اطاعت کرتے رہے ۔ ماں نے جو کہا، اُس کی تعمیل کی لیکن اُن کی وفات کے بعد انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو گھر لے جانا چاہا اور کئی مہینے تک کوشش جاری رکھی ۔ وہ بار بار علامہ کے والد کے پاس طرفین کے رشتے داروں کو مصالحت کے لیے بھیجتے رہے ۔ پہلے تو ادھر سے انکار ہوتا رہا ۔ پھر بہت کچھ سوچ بچار کے بعد علامہ کے والد اور والدہ صاحبہ دونوں رضامند ہو گئے ۔ ساس اور سسر کی رضامندی کا سہارا پا کر علامہ کے بہنوئی کچھ عزیزوں کو ساتھ لے کر اپنی سسرال آ گئے ۔ اتفاق کی بات کہ اُن

دونوں علامہ بھی سیالکوٹ گئے ہوئے تھے۔ انھیں جب اس کا علم ہوا کہ اُن کے بہنوئی مصالحت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں، تو اُن کی برہمی کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی۔ والد صاحب نے بہت کچھ سمجھایا مگر علامہ یہی کہتے رہے کہ مصالحت نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ آنے والوں کو واپس کر دیا جائے۔ اُن کے والد نے جب دیکھا کہ اقبال کسی طرح رضامند ہی نہیں ہوتے تو انھوں نے خاص انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" فرمایا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ علامہ خاموش ہو گئے۔ اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، جیسے کسی نے سلگتی ہوئی آگ پر برف کی سل رکھ دی ہو۔ اُن کے والد نے قدرے توقف کے بعد علامہ سے پوچھا کہ پھر کیا فیصلہ کیا جائے؟ علامہ نے جواب دیا، وہی جو قرآن کہتا ہے۔ چنانچہ مصالحت ہو گئی اور چند دن کے بعد اُن کے بہنوئی اپنی بیوی یعنی علامہ کی چھوٹی بہن کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے گئے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ صلح خیر ہی ثابت ہوئی۔ پہلی بیوی ہونے کی حیثیت سے گھر کا پورا اختیار علامہ کی بہن کے ہاتھ میں رہا۔ مگر انھوں نے سوکنوں اور اُن کی اولاد کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ بدمزگی اور شکر رنجی کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ سب لوگ ایک ہی گھر میں ایک خاندان کے افراد کی حیثیت سے رہتے تھے۔ علامہ کے بہنوئی کی دونوں بیویاں تو وفات پا چکی ہیں، اُن کی بہن بفضلِ خدا ابھی تک حیات ہیں۔ علامہ کے بہنوئی بڑے زیرک اور معاملہ فہم بزرگ ہیں۔ مصالحت کے چند دن کے بعد ہی علامہ کو اُن پر اس قدر اعتماد ہو گیا

تھا کہ اپنے نجی کاموں میں اُن کے مشورے پر عمل کرتے اور ان کی خیر خواہی کی قدر کرتے۔

ملازمت سے بیزاری

انگلستان جانے سے پہلے علامہ اقبال اورینٹل کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار اور اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد کچھ دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر بھی رہے، لیکن ملازمت سے انھیں طبعی نفرت اور بیزاری تھی۔ ولایت سے واپسی پر انھیں انڈین ایجوکیشنل سروس (I.E.S.) کی پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے بیرسٹری کے آزاد پیشے کو اس پابندی پر ترجیح دی۔ اوّل تو علامہ نے قلندرانہ مزاج اور آزاد طبیعت پائی تھی، پھر ایک واقعے نے اس رنگ کو اور بھی تیز اور پختہ کر دیا۔ فرماتے تھے کہ میں جن دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھا، وہاں کے پرنسپل نے طالب علموں کی حاضری کے بارے میں مجھ سے کچھ ایسے انداز میں گفتگو کی جیسے کوئی عہدیدار کلرک سے کرتا ہے۔ بس اُس دن سے ملازمت سے میرا دل کھٹا ہو گیا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا، ملازمت سے دامن کشاں ہی رہوں گا۔

○

سر سیّد کی وفات کا مادّۂ تاریخ

سرسید احمد خاں کی وفات کا جو مادۂ تاریخ علامہ اقبال نے نکالا تھا۔ اُس کا ذکر "روزگارِ فقیر" کی پہلی جلد میں آچکا ہے۔ جس آیت سے یہ مادۂ تاریخ عبارت ہے اُس کا تعلق حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے ہے' اِس لیے سیالکوٹ کے بعض علمائے دین نے اِس پر اعتراض کیا۔ اعجاز احمد صاحب کا بیان ہے کہ جب علامہ تک یہ بات پہنچی تو اُنھوں نے دُوسرا مادۂ تاریخ نکالا ــــــ

"کَانَہٗ مَسِیۡحٌ لِکُلِّ مَرَاضٍ"

۱۳۱۵ھ

صحت اور ورزش

علامہ اقبال خاندان کے نوجوانوں کو جسمانی ورزش کی تاکید فرمایا کرتے۔ ایک مرتبہ وہ سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ لعل دین پہلوان اُن سے ملنے کے لیے آئے جو شیخ صاحب کے محلے کے قریب رہتے تھے اور وہیں اُن کا اکھاڑہ تھا۔ علامہ نے شیخ صاحب کو اُن کے سپرد کیا اور روزانہ اکھاڑے جا کر کسرت کرنے کی تاکید کی۔ علامہ اکثر تاکید کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے' زندگی کو باقاعدہ اور سادہ بنانے کی کوشش کرو۔ جوانی کی توانائی سے فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ صحت دیر تک قائم رہے۔ جسمانی اور رُوحانی صحت کی ضامن مذہبی زندگی ہے۔ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی بہت تاکید فرماتے تھے کہ ان کی صحبت میں اکسیر کی تاثیر ہے۔

مسواک

علامہ اقبال ایک بار گھر کی صفائی ستھرائی پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام نے صفائی پر کتنا زور دیا ہے۔ پھر دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کے فواید کا ذکر کیا۔ کچھ عرصے بعد ایک خط میں شیخ صاحب نے علامہ سے دریافت کیا کہ اب تو اچھے اچھے ولایتی منجن ملتے ہیں۔ کیا وہ مسواک کا نعم البدل نہیں ہو سکتے؟ اس کے جواب میں علامہ نے لکھا ——

"مسواک سے میری مراد دیسی مسواک تھی نہ کہ انگریزی طرز کے منجن اور برش۔ کیونکہ یورپ کی بنی ہوئی بعض چیزیں خوبصورت ضرور ہوتی ہیں، مگر ان میں اخلاقی زہر ہوتا ہے۔ جس کا اثر آج کل کے مادہ پرست مزاج رکھنے والے انسان فوراً محسوس نہیں کر سکتے۔"

یورپ کے قیام کے دوران میں ہو سکتا ہے کہ دیسی مسواک نہ ملنے کے سبب علامہ اقبال نے انگریزی منجن وغیرہ استعمال کیا ہو، لیکن لاہور میں اُن کے غسل خانے میں ایک دیسی مسواک ہمیشہ ہوتی تھی۔

مسواک کا استعمال اس لیے مبارک اور مفید ہے کہ اس میں سنتِ رسول ﷺ کا اتباع مضمر ہے۔ یہی مقدس جذبہ تھا جس نے مسواک کو علامہ کی نگاہ میں محبوب بنا دیا تھا۔ عشق و محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ محبوب کی ہر چیز محبت اور عاشق

کو محبوب و پسندیدہ نظر آئے۔ "فنافی الرسولؐ" کی مشہور صوفیانہ اصطلاح کا لُبّ لُباب یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام و مرضیات میں اپنی مرضی اور خواہش کو گم کر دیا جائے اور سنّتِ رسولؐ کی پوری اطاعت کی جائے۔

حُقّے کا شوق

علامہ اقبال کو دُنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ دلچسپی حقّے سے تھی۔ اُن کے والد اور بڑے بھائی بھی حُقّے کے بڑے شوقین تھے۔ شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۱۲ء میں اُن کے والد کیمبل پور میں تعینات تھے۔ انھی دنوں عدالتِ عالیہ کے بند ہو جانے پر علامہ اقبال اپنے وطن سیالکوٹ تشریف لائے ہوئے تھے۔ اتفاق کی بات کہ کیمبل پور سے ایک شخص آیا اور علامہ کو مقدمے کی پیروی کے لیے کیمبل پور لے جانا چاہا۔ علامہ اقبال سفر سے بہت جی چُراتے تھے، لیکن اس خیال سے کہ اس بہانے بڑے بھائی سے کیمبل پور میں ملاقات بھی ہو جائے گی، مقدمہ لے لیا۔ علامہ کیمبل پور پہنچے، شیخ اعجاز احمد اس سفر میں ان کے ہمراہ تھے۔ واپسی پر آدھی رات کے قریب وزیر آباد جنکشن سے سیالکوٹ کے لیے گاڑی بدلنی تھی جو صبح کے پانچ بجے چلتی تھی۔ سیالکوٹ جانے والی گاڑی میں علامہ آکر بیٹھ گئے۔ اب انھیں حُقّے کی طلب ہوئی۔ قلی جو سامان اُٹھا کر لایا تھا، اُس سے کہا کہ اگر اس وقت کہیں سے حُقّہ لے آؤ تو تمھیں انعام ملے گا۔ قلی انعام کے لالچ میں آٹھ بجے واپس ہوا اور تھوڑی سی دیر میں ایک بوسیدہ سا حُقّہ لے کر آ گیا۔ اس حقّے کی

حیثیت یہ تھی کہ مٹی کا چینیا اور ٹوٹی ہوئی چلم۔ کہنگی اور بوسیدگی میں یہ حقہ اپنی مثال آپ ہی تھا۔ مگر علامہ اقبال اس حقے کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ اُنھوں نے اپنے بندھے ہوئے بستر کو پلیٹ فارم پر رکھوایا۔ اس پر بیٹھ کر حقے کے کش لگانے لگے۔ قلی بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور علامہ اقبال حقہ پیتے ہوئے اس قلی کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ جب علامہ حقہ پی کر سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں آ گئے تو شیخ اعجاز احمد نے کہا کہ حقہ تو بہت گندا تھا۔ نہ جانے قلی کہاں سے ُکس کا اٹھا لایا تھا۔ علامہ نے اس کے جواب میں کہا کہ جس کو تمباکو کی عادت پڑ جائے، اُسے طلب کے وقت اِن نزاکتوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمایا:

"تم اس کی عادت نہ ڈالنا ۔۔۔"

اعجاز صاحب کہتے ہیں کہ گھر کے سبھی مرد حقہ یا سگریٹ پیتے ہیں، لیکن انھیں آج تک تمباکو نوشی سے مکمل اجتناب رہا ہے۔

اجنبی زبان

جن دِنوں شیخ صاحب موصوف مرے کالج، سیالکوٹ میں ایف۔ اے کے طالب علم تھے، اُن کے ایک پروفیسر علامہ اقبال سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ علامہ نے ان کی پڑھائی کے بارے میں پروفیسر صاحب سے استفسار کیا۔ انھوں نے پہلے تو رسمی طور پر کچھ تعریف کی۔ پھر شیخ صاحب کی تعلیمی حالت پر تنقید کر کے بعض نقائص کی بھی نشان دہی کر دی۔ اُنھوں نے کہا ۔۔۔۔

انگریزی میں طرزِ تحریر تو اچھا ہے مگر ذخیرۂ الفاظ (Vocabulary) کی بہت کمی ہے اور لفظوں کے ہجے عموماً غلط لکھتا ہے۔

ریاضی میں اس قدر کمزور ہے کہ ایف۔ اے میں اس مضمون میں پاس ہو جائے تو غنیمت ہے۔

گھومتا پھرتا بہت ہے۔ جم کر بیٹھنے سے نفرت معلوم ہوتی ہے۔

اس پر علامہ اقبال نے شیخ صاحب کے والد کو خط لکھا کہ گھومنا پھرنا اور جم کر نہ بیٹھنا پہلے دو نقصوں کا ذمہ دار ہے۔ اگر بیٹھنے کی عادت ہوگی تو رفتہ رفتہ پڑھنے کی بھی عادت ہوگی ـــ پڑھنے کی عادت ہوگی تو انگریزی کے بہت سے الفاظ بھی یاد ہو جائیں گے اور ہجے کی غلطیاں بھی درست ہو جائیں گی ـــ علامہ نے فرمایا کہ ہجے (Spelling) درست کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کثرت سے مطالعہ ہو اور ہر وہ لفظ جس کے معنی نہ معلوم ہوں، اُس سے صرفِ نظر نہ کیا جائے بلکہ اُس کے معنی ڈکشنری میں دیکھ لیے جائیں۔ زبان سیکھنے کے لیے انگریزی ناولوں کا مطالعہ کارآمد اور مفید ہے۔ دلچسپی کی دلچسپی اور ساتھ ہی زبان بھی آجاتی ہے۔

مثنوی "اسرارِ خودی"

علامہ کی مشہور مثنوی "اسرارِ خودی" کے متعلق اعجاز صاحب نے بعض ایسے واقعات بیان کیے ہیں، جن کا یہاں ذکر کرنا دلچسپی کا باعث ہو گا — وہ فرماتے ہیں کہ —

گرمیوں میں جب عدالتوں کی چھٹیاں ہوتیں تو علامہ اقبال سیالکوٹ تشریف لاتے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ رات کو سب لوگ چھت پر سوتے تھے۔ علامہ اور اُن کے والدِ بزرگوار کی چارپائیوں کے درمیان حقہ بھر کر رکھ دیا جاتا اور باپ بیٹے، دونوں دیر تک علمی گفتگو میں مشغول رہتے۔ گھر کے لڑکے جن میں شیخ صاحب بھی شامل تھے۔ ان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ ان بزرگوں کے بدن دباتے رہیں۔

۱۹۱۴ء میں مثنوی "اسرارِ خودی" زیرِ تکمیل تھی۔ اس لیے رات کی مجلسوں میں اسی کے مضامین کا ذکر رہتا۔ بعض اوقات علامہ اپنے والد کو مثنوی کے اشعار سناتے۔ ایک دن فرمایا کہ اس مثنوی میں اُس حقیقی اسلام کو جسے رسولِ مقبول نے پیش کیا تھا، دکھانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ

ہندوستان کے مسلمان اُس عربی اسلام کو بہت کچھ فراموش کر چکے ہیں اور عجمی اسلام ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔

گفتگو کے دوران میں تصوف کا ذکر چھڑ گیا۔ علامہ عجمی تصوف کے رائج الوقت مفہوم کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اکثر ایرانی شعراء پر کڑی تنقید اور نکتہ چینی کرتے اور فرماتے تھے: انھوں نے بڑے "Subtle" انداز میں شعائر اسلامی پر چوٹیں بلکہ اُن کی تردید کی ہے۔

۱۹۱۵ء میں جب "اسرارِ خودی" شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ علامہ نے اپنے والد کی خدمت میں بھیجا، جسے وہ عام طور پر صبح کے وقت بڑے شوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اس مثنوی میں علامہ نے حافظ شیرازی پر ۳۵ شعروں میں کڑی تنقید کی تھی اور اس کے مقابلے میں عُرفی کو سراہا تھا۔ یہ مثنوی جب چھپ کر منظرِ عام پر آئی تو اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ خاص طور سے صوفیوں کے حلقوں میں مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اُن کی طرف سے اخبارات میں مثنوی کی مخالفت میں مضامین شائع ہوئے۔ بعض ناقدین نے اعتراض کو یہ رنگ تک دے دیا کہ اس مثنوی کا مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات و افکار سکھانا اور اُن کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ ایک پیرزادہ صاحب نے "رازِ بے خودی" کے نام سے ایک جوابی مثنوی چھپوائی جس میں علامہ کو جی بھر کر بُرا بھلا کہا گیا۔ صرف ایک شعر سے اس مثنوی کے لہجے کی تلخی، اندازِ بیان کی درشتی اور تنقید کی شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بندۂ دُنیا بہ دُنیا دیں فروش

سر بسر ملت فروش آئیں فروش

("رازِ بے خودی" از خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد فضلی)

علامہ کی مثنوی "اسرارِ خودی" کے خلاف جب یہ ہنگامہ گرم تھا، اُنھی دنوں علامہ سیالکوٹ تشریف لائے اور باپ بیٹے جب یک جا بیٹھے تو مثنوی پر حلقۂ صُوفیاء کی برہمی کا ذکر آیا۔ علامہ نے فرمایا کہ میں نے حافظ کی ذات اور شخصیت پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے صرف ایک اصُول کی تشریح کی ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ مسلمانانِ وطن پر عجمی اثرات اس قدر غالب آ چکے ہیں کہ وہ زہر کو آبِ حیات سمجھتے ہیں۔ علامہ کے والدِ بزرگوار نے بڑی مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی۔ اُنھوں نے اس پر فرمایا کہ اگر حافظ کے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اصُول کی تشریح کر دی جاتی تو اچھا تھا۔ علامہ نے اس کے جواب میں کہا "یہ حافظ پرستی" بھی تو بُت پرستی سے کم نہیں۔ اس پر اُن کے والد نے فرمایا کہ اللہ اور اُس کے رسُولؐ نے تو بُتوں کو بھی بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے مثنوی کے وہ اشعار، جن پر عقیدت مندانِ حافظ کو اعتراض ہے، آئندہ ایڈیشن میں اُن کا حذف کر دینا ہی مناسب ہوگا۔ علامہ نے اس پر زبان سے کچھ نہیں کہا، بس مُسکرا کر رہ گئے اور اپنے والدِ محترم سے بحث کرنے کی بجائے اُن کے حضُور سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بعد کی اِشاعتوں میں علامہ نے حسبِ ذیل ۳۵ اشعار مثنوی سے خارج کر دیے:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

رہنِ ساقی خرقۂ پرہیزِ اُو!
مے علاجِ ہولِ رستا خیزِ اُو

نیست غیر از بادہ در بازارِ اُو
از دو جام آشفتہ شد دستارِ اُو

چوں غراب از بادۂ گلگوں شود
مایہ دارِ حشمتِ قارُوں شود!

مفتیِ اقلیمِ او مینا بدوش — محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش

طوفِ ساغر کرد مثلِ رنگِ مے — خواست فتویٰ از ربابِ چنگ و مے

در رموزِ عیش و مستی کاملے — از خمِ خوں در دے پا در گلے

رفت و شغلِ ساغر و ساقی گذاشت — بزمِ رندان و مے باقی گذاشت!

چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزلِ جاناں ندید

در محبت پیرِ فرہاد بود — بر لبِ او شعلۂ فریاد بود

تخمِ نخلِ آہ در کہسار کاشت — طاقتِ پیکار با خسرو نداشت

مسلم و ایمانِ او زنار دار — رخنہ اندر دینش از مژگانِ یار

آنچناں مستِ شرابِ بندگی ست — خواجہ و محرم ز ذوقِ خواجگی ست

"دعویٰ او نیست غیر از قال و قیل — دستِ او کوتاہ و خرما بر نخیل"

آں فقیہِ ملتِ مے خوارگاں — آں امامِ امتِ بے چارگاں

گوسفند است و نوا آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است!

دل ربائی ہائے او زہر است و بس — چشمِ او غارت گرِ شہر است و بس

ضعف را نامِ توانائی دہد! — سازِ او اقوام را اغوا کند

از بزِ یوناں زمیں زیرک تر است — پردۂ ناموسِ حجابِ اکبر است!

نغمۂ چنگش دلیلِ انحطاط — ہاتفِ او جبرئیلِ انحطاط

بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن[1] دارد حشیش!

---

[1] فرقۂ باطنیہ۔

از تخیل جنتے پیدا کند ‏ مر ترا بر نیستی شیدا کند!
ناوک اندازے کہ آب از دل برد ‏ ناوکِ او مرگ را شیریں کند
مارِ گلزارے کہ دارد زہرِ لب ‏ صید را اوّل ہمی آرد بخواب
عشق با حسنِ نگہش خود کشی است ‏ کشتنش مشکل کہ مارِ خانگی است
حافظِ جادو بیاں شیرازی است ‏ عرفیِ آتش زباں شیرازی است
ایں سوئے ملکِ خجندی رکب جہاند ‏ آں کنارِ آبِ رکن آباد ماند!
ایں قتیلِ ہمتِ مردانہ ‏ آں ز رمزِ زندگی بیگانہ
دستِ ایں گیرد ز انجم خوشہ ‏ چشمِ آں از اشک دارد توشہ
روزِ محشر رحم اگر گوید بجیب ‏ عرفیا! فردوس و حوراء و حریر
غیرتِ او خندہ بر حوراء زند ‏ پشتِ پا بر جنتِ الماوے زند
بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز! ‏ زندۂ؟ از صحبتِ حافظ گریز!
ایں فسوں خواں زندگی از ما ربود ‏ جامِ او شانِ جمی از ما ربود
محفلِ او در خورِ ابرار نیست ‏ ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

مثنوی "اسرارِ خودی" کا نصف صدی پہلے کا یہ نسخہ شیخ اعجاز احمد صاحب کی تحویل میں ہے۔ اس نسخے کے دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ اتنی عظیم اور معرکہ آرا کتاب پہلی بار صرف پانسو (۵۰۰) کی تعداد میں شائع ہُوئی۔ مقامِ عبرت ہے کہ جس کتاب کی

بعد میں یورپ میں دھوم مچی' ہندوستان میں اس کی محدود دلچسپی کا اندازہ کر کے علامہ نے اسے صرف پانچ سو کی تعداد میں چھپوایا۔ اسی نسخے سے وہ اشعار نقل کیے گئے ہیں' جو بعد کے ایڈیشنوں میں حذف کر دیے گئے۔

مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن نے "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کیا' جو ۱۹۲۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس ترجمے پر انگلستان' امریکہ اور جرمنی وغیرہ ملکوں کے اخبارات میں ریویو شائع ہوئے' جن کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے والد کو خط لکھا کہ آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ جب یہ مثنوی شائع ہوئی تھی تو یہاں کے صوفیا نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے' لیکن مغرب کے مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ مثنوی زبردست آواز ہے' جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں جو سوزِ صداقت ہے' اس کی ہم تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر ایک خط علامہ نے اپنے بڑے بھائی صاحب کو لکھا کہ ـــــ

"اسرارِ خودی" پر ریویو یورپ اور امریکہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ جو کچھ یہاں ہوا تھا' وہاں بھی وہی ہو رہا ہے کوئی کچھ کہتا ہے' کوئی کچھ۔ مگر بہ حیثیت مجموعی وہاں کے لوگ اس مثنوی کے خیالات کو بہت اچھا جانتے ہیں۔ مترجم کا خط آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کتاب کا استقبال اس ملک میں بہت اچھی طرح ہوا ہے۔ گو بعض خیالات کے متعلق بعض ریویو لکھنے

والوں کو غلط فہمی بھی ہوئی ہے۔ ایسا ہونا یقینی ہوتا ہے کیونکہ طبائع میں اختلاف ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ زندگی پر ایک نئے نقطۂ خیال سے نگاہ ڈالی جائے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کتاب کے مصنف نے ایشیا والوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو جنگ کی تعلیم دی ہے اور اس کے ہر لفظ میں ایک سیاسی قوت چھپی ہوئی ہے۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک عظیم شخصیت کی صحبت میں بیٹھے ہیں۔ غرضکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہو جانے میں خدا کی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے اس کتاب کے مقاصد پورا ہونے میں مدد ملے گی۔"

علامہ نے ان دنوں بارہا اپنے اس تاثر کا اظہار فرمایا کہ جس قوم کے لیے یہ مثنوی لکھی گئی ہے، وہ نہ تو ٹھیک طرح سے اس کے مفہوم کی تہ کو پہنچتی ہے اور نہ اس آواز اور پیغام کو سنتی ہے، مگر جن قوموں سے اس مثنوی میں خطاب ہی نہیں کیا گیا، وہ اس کا مطلب سمجھ گئی ہیں۔

علامہ اقبال کی حیات میں بعض صوفیا نے اُن پر خوب کس کر تنقید کی بلکہ دشنام طرازی پر اُتر آئے۔ اُن کو "فلسفی فطرت زدیں برگشتہ" تک کہہ دیا، مگر وفات کے بعد ایک ۲۵ اپریل کو اخبارات میں حسب ذیل خبر بھی نظر سے گزری:

"علامہ اقبال کو بزمِ جمالی کا خراجِ عقیدت

بزمِ جمالی کے زیرِ اہتمام حکیم الامت مفکرِ اعظم، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمہ کا یوم منایا گیا، جس میں صوفیاء کرام و مشائخ عظام نے حلقۂ ذکر و شغل، فاتحہ خوانی و نعت خوانی سے اور قرآن خوانی کا ثواب پہنچا کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا صوفیانہ و عارفانہ کلام پیش کیا گیا۔ علامہ اقبال نے بحیثیت صوفی کے جو خدمت و اشاعت دینِ اسلام کی کی ہے اُس کو سراہا گیا۔ آپ کا روحانی اور ابدی پیغام دنیا کے لیے راہِ رُشد و ہدایت ہے اور زندۂ جاوید یادگار ہے۔"

ہائے! اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

خُداداد نعمت

شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں جب علامہ اقبال کو وکالت کرتے ہوئے دس سال ہو چکے تھے تو انھوں نے اپنے والد کو خط میں لکھا ——

"میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے جس میں میری محنت کو کوئی دخل

نہیں، خلق اللہ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیے، لیکن
ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس ارادے کے خلاف
کرنا پڑا۔"

علامہ کے فرمانے کے مطابق ۱۰ سال کی پریکٹس میں بیس پچیس ہزار روپیہ اُن کے ہاتھ میں آیا (یعنی یہ کہ اتنی رقم پس انداز ہوئی)۔ یہ رقم اپنے موقع پر مناسب طور پر خرچ ہوئی۔ لیکن اس وقت تک علامہ نہ تو کوئی معقول مکان کرایے پر لے سکے اور نہ اچھا فرنیچر اور ساز و سامان مہیا کر سکے۔ علامہ نے اپنے والد بزرگوار کے نام ایک خط میں اپنی اس ضرورت کا اظہار یوں کیا:

"حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں کہ وکالت کے
پیشے کے لیے ان لوازمات کا بہم پہنچانا ضروری ہو گیا ہے اس
لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ یہ لوازم بہم پہنچائے جائیں۔"

—— لیکن ——

اُن کا یہ ارادہ بس ذہن و فکر ہی تک محدود رہا، عملی جامہ نہ پہن سکا۔ انار کلی والا مکان چھوڑ کر علامہ اقبال نے میکلوڈ روڈ پر کوٹھی کرایے پر تو ضرور لی مگر وہ "عمدہ مکان" کہے جانے کی کسی طرح مستحق نہ تھی۔ تھوڑا بہت ساز و سامان بھی خریدا۔ لیکن وہ معمولی تھا۔ زندگی کے آخری سالوں میں ایک موٹر بھی رکھا، لیکن پرانا ـــــ اصل بات یہ ہے کہ علامہ نے قلندرانہ مزاج اور درویشانہ طبیعت پائی تھی۔ اسی شانِ استغنا کے سبب وہ زندگی کو ظاہری اعتبار سے دیدہ زیب پرشکوہ

اور آرام دہ بنانے کے لیے جد و جہد نہ کر سکے۔

مکان اور کوٹھی کا ذکر چلا ہے تو ۱۹۱۹ء کے ایک خط کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو شیخ صاحب کو علامہ اقبال نے لکھا تھا ـــــــ

"والدِ مکرم کی خدمت میں عرض کر دیں کہ کوٹھی کی تلاش میں ہوں۔ تعویق اس واسطے ہوئی کہ کوٹھی موقعے کی نہیں ملتی اور جو کوٹھیاں موقعے کی ہیں، اُن کے مالک ہندو ہیں، جو قدرتی طور پر ہندو کرایہ دار کو ترجیح دیتے ہیں۔ کوٹھی نہ ملنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ کم بخت ..... (ایک صاحب جانثار مسلمان کا نام تھا) نے وعدہ کیا اور بعد میں بدعہدی کر کے، جو آج کل کے مسلمانوں کا عام شیوہ ہے، کوٹھی کسی اور کو دے دی۔"

دنیائے اسلام کا مستقبل

عالم اسلام کے اضطراب و انتشار اور زبوں حالی کا علامہ اقبال کو پورا احساس تھا۔ یہ احساس بڑا غم انگیز تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انھیں اس بات کا یقین تھا کہ اسلام کو ایک مرتبہ پھر عروج اور غلبہ حاصل ہوگا۔ ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ اس عروج کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

علامہ کی ایک بہن بڑی عابدہ زاہدہ تھیں۔ وہ اب وفات پا چکی ہیں۔

۱۹۱۹ء میں انھوں نے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر علامہ کے والدِ محترم نے یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو دوبارہ ترقی عطا فرمائے گا۔ علامہ کو جب اس خواب اور تعبیرِ خواب کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ خواب میں جو حالت دکھائی گئی ہے آج عالمِ اسلام کی واقعی یہی حالت ہے اور والد صاحب نے خواب کے واقعات وعلامات سے جو نتیجہ نکالا ہے' وہ بھی صحیح ہے۔ میرا بھی یہی عقیدہ اور یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نئی زندگی عطا فرمائے گا اور جس قوم نے اس کے دین کی آج تک حفاظت کی ہے' اس کو ذلیل ورسوا نہ کرے گا۔

گمنام خط

شیخ اعجاز احمد نے مجھے بتایا کہ ۱۹۲۰ء کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کے نام ایک گمنام خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ —— نبی کریم کے دربار میں تمھاری ایک خاص جگہ ہے جس کا تم کو کچھ علم نہیں۔ اگر فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تم کو بھی اس کا علم ہو جائے گا۔ اس شخص نے وظیفے کے الفاظ بھی اس خط میں لکھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خیال سے کہ کاتبِ خط نے اپنا نام نہیں لکھا' اس گمنام خط کی طرف توجّہ نہیں کی اور وہ خط ضائع ہو گیا۔

اس خط کے تین چار مہینے بعد کشمیر سے ایک پیرزادے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے آئے۔ عمر تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ بشرے سے شرافت کا اور چہرے مہرے سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس شخص نے ڈاکٹر صاحب کو

دیکھتے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خیال کیا کہ یہ شخص مصیبت زدہ اور پریشان حال ہے اور میرے پاس اپنی کوئی ضرورت لے کر آیا ہے۔ اُنھوں نے شفقت آمیز لہجے میں استفسارِ حال کیا تو وہ بولا کہ مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی۔ اب میں اُس کی پنشن کھا رہا ہُوں۔ میرے اس بے اختیار رونے کی وجہ خُوشی ہے نہ غم۔

ڈاکٹر صاحب کے مزید استفسار پر وہ بولا۔ میں سری نگر کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہُوں (گاؤں کا نام شاید نوگام بتایا تھا)۔ وہاں میں نے ایک دن عالمِ کشف میں نبیِ کریمؐ کا دربار دیکھا۔ صفِ نماز کے لیے کھڑی ہُوئی تو حضورِ سرورِ کائنات نے دریافت فرمایا کہ محمدؐ اقبال آیا یا نہیں؟ معلوم ہُوا کہ محفل میں نہ تھا۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان آدمی جس کی ڈاڑھی منڈی ہُوئی تھی اور رنگ گورا تھا، ان بزرگ کے ساتھ نمازیوں کی صف میں داخل ہو کر حضورؐ کی دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

اُس کشمیری پیرزادے نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں نے آج سے پہلے نہ تو آپ کی شکل دیکھی تھی، نہ میں آپ کا نام اور پتہ جانتا تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ مولوی نجم الدین صاحب ہیں، اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے یہ ماجرا بیان کیا تو اُنھوں نے آپ کا نام لے کر آپ کی بہت تعریف کی کیونکہ آپ کی

تحریروں کے واسطے سے وہ آپ کو جانتے تھے، گو انھوں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا
اُس دن سے مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ میں نے آپ کو دیکھنے
اور آپ سے ملنے کے لیے کشمیر سے لاہور تک کا یہ سفر کیا ہے۔ آپ کی صُورت
دیکھتے ہی میری آنکھیں اس لیے بے اختیار اشکبار ہو گئیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے
کشف کی عالمِ بیداری میں تصدیق ہو گئی۔ کیونکہ جو شکل میں نے حالتِ کشف میں
دیکھی تھی، آپ کی شکل و شباہت ٹھیک اُسی کے مطابق ہے۔ سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

پیرزادے کی زبان سے اس گفتگو کو سُن کر ڈاکٹر صاحب کو وہ گمنام خط یاد آ گیا، جس کا ذکر اُوپر کی سطروں میں ہو چکا ہے۔ اُس خط میں جو وظیفہ لکھا تھا، وہ انھیں یاد نہیں رہا تھا۔ پیرزادہ صاحب ملاقات کے بعد چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سارے واقعے کی تفصیل اپنے والدِ بزرگوار کو ایک خط میں لکھی اور اس کا بھی اظہار کیا کہ مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح شدید کرب و اضطراب میں مبتلا ہے کہ میں نے وہ خط کیوں ضائع کر دیا۔ اب آپ ہی اس کی تلافی کی کوئی تدبیر بتائیں، کیونکہ پیرزادہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کے بارے میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ کوئی شک نہیں، پیرزادہ صاحب نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ کیونکہ میرے اعمال تو اس قابل نہیں ہیں۔ ایسا فضل ضرور ہے کہ دُعا کا ہی نتیجہ ہو۔ اس لیے آپ یا تو کوئی علاج و تدبیر بتائیں یا خاص طور سے دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس گرہ کو کھول دے، کیونکہ پیرزادہ صاحب کا کشف اگر صحیح ہے تو میرے لیے بے خبری اور لاعلمی کی یہ حالت سخت

تکلیف دہ ہے۔

دعاء

اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ ـــــ

پچا جان کو دُعا، پر بڑا اعتقاد تھا۔ ان کا کلام پڑھنے سے اس اعتقاد کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے اشعار میں جہاں دُعا کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دُعا رسمی نہیں، بلکہ دل سے نکل رہی ہے۔ نبی کریم پر درود بھیجنا بھی ان کے معمولات میں تھا اور اپنے خطوں میں اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھا کہ ـــــ

"مسلمان کی بہترین تلوار دُعا ہے۔ اس سے کام لینا چاہیے۔ ہر وقت دُعا کرنی چاہیے اور نبی کریم پر درود بھیجنا چاہیے۔"

اوراد کے بھی قائل تھے۔ جب مجھے بی۔ اے کا امتحان دینا تھا تو دادا جان کی ہدایت پر میری کامیابی کے لیے آیۂ کریمہ کا ورد بھی کیا تھا، چنانچہ دادا جان کو لکھا کہ ـــــ

"اُمید ہے، آپ کی دُعا سے اعجاز امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ آیۂ کریمہ کا ورد شروع ہے۔"

تزکیۂ نفس

علامہ اقبال کے تذکرہ نگاروں نے اُن کی سادگیِ غذا کا ذکر کیا ہے۔ علامہ کو کھانوں میں، کچھ شک نہیں، بعض چیزیں مرغوب تھیں اور جوانی میں انھیں بڑے شوق سے کھاتے تھے، مگر وہ ——

تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن است

کے ہرگز قائل نہ تھے۔ ۱۹۲۰ء میں اپنے والد کو انھوں نے خط میں لکھا ——

"رُوحانی کیفیات میں سب سے بڑا ممد و معاون کھانے پینے میں احتیاط ہے۔ نبیؐ کریم کی ساری زندگی اِس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے معاملات میں اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔"

شیخ صاحب موصوف کا بیان ہے کہ پھلوں میں علامہ اقبال کو آم بہت مرغوب تھے، مگر مالدہ آم پسند نہ تھے۔ اِس کے برخلاف سردار بیگم جان (والدۂ جاوید) کو مالدہ آم پسند تھے۔ بازار سے جب کبھی آم منگوائے جاتے تو بچاجان (علامہ اقبال) اپنی پسند کے آموں کے لیے کبھی فرمائش نہ کرتے۔

اُن کے بعض احباب آموں کی فصل میں آم بھیجا کرتے تھے۔ جب آموں کی پیٹی کھلتی تو علی بخش سے کہتے کہ سب سے اچھا آم چُن کر مجھے دو۔ وہ جب اپنی پسند کے مطابق آم منتخب کر کے علامہ کو دیتا تو علی بخش سے کہتے کہ اِس آم

کو تم کھا لو۔ مرغوباتِ نفس کے خلاف یہ وہ طرزِ عمل ہے جو تزکیۂ نفس کے لیے صوفیاء کرام کا شعار رہا ہے۔

تلاوتِ قرآن

شیخ اعجاز احمد راوی ہیں کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد جب انھوں نے سیالکوٹ میں وکالت شروع کی تو علامہ اکثر خطوط میں ان کو نماز اور تلاوتِ قرآن کی تلقین فرمایا کرتے۔ ایک خط میں لکھا ــــــ

"قرآن پر میں زیادہ اصرار کرتا ہوں کہ اس کے پڑھنے کے فوائد میرے تجربے میں آچکے ہیں"۔

اعجاز صاحب کہتے ہیں کہ انھوں نے مدرسے میں داخل ہونے سے پہلے ہی قرآنِ کریم ختم تو کر لیا تھا، لیکن اسکول اور کالج میں تعلیم کے تیرہ چودہ سالوں کے دوران میں پھر کبھی قرآن پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا' اس لیے روانی سے تلاوت نہ کر سکتے تھے اور زیر زبر کی غلطی کا بھی احتمال تھا۔ علامہ کے تاکید فرمانے پر انھوں نے ارادہ کیا کہ کسی حافظ قرآن سے پھر قرآنِ کریم دہرا لیا جائے۔ ان دنوں سیالکوٹ کی ایک مسجد کے امام ایک نوجوان نابینا حافظِ قرآن تھے۔ اُن کا نام محمد رمضان تھا۔ انھیں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ قرآن پڑھانے کی کوئی اُجرت نہ لیتے تھے۔ جس نوجوان کو قرآنِ کریم کی تعلیم دیتے۔ اُس کا نام اپنی پاکٹ بک میں جو ہمیشہ

ان کی جیب میں رہتی، لکھوا لیتے۔ ان کی کوشش رہتی کہ شاگردوں کی اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہے۔ جب اعجاز صاحب کی خواہش کا انھیں علم ہوا تو انھیں بھی اس فہرست میں شامل کر لیا۔

اعجاز صاحب کہتے ہیں کہ حافظ صاحب کو علامہ کا کلام سننے کا بڑا شوق تھا اور اکثر ان سے علامہ کا کلام سنا کرتے تھے۔ ایک بار عدالت کی تعطیلات میں علامہ سیالکوٹ تشریف لائے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب کو جب اُن کے آنے کا حال معلوم ہوا تو پُر شوق لہجے میں اعجاز صاحب سے کہا "کدی سانوں وی بزرگاں دیاں زیارتاں کراؤ ناں"۔ (کبھی ہمیں بھی بزرگوں کی زیارت کرائیے نا!)

شیخ صاحب نے علامہ سے کہا کہ میرے اُستاد حافظ صاحب جو نابینا ہیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو انھیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟ علامہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ وہ تمھارے اُستاد ہیں اور وہ بھی قرآن کے۔ ان کی عزت ہم پر لازم ہے۔ میں اُن سے ملنے کے لیے وہیں آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد باہر والے کمرے میں جہاں حافظ صاحب قرآن پڑھایا کرتے تھے تشریف لے آئے۔ حافظ صاحب سے مصافحہ کیا۔ حافظ صاحب کی عادت تھی کہ نئے آدمی سے ملتے تو اُس کے چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر اُس کی شناخت کرتے۔ جو لوگ بصارت سے محروم ہوتے ہیں، اُن کی قوتِ حاسہ بہت زیادہ تیز اور نازک ہوتی ہے اور انگلیاں آنکھوں کا کام انجام دیتی ہیں۔ چنانچہ

حافظ صاحب نے قوّتِ لامسہ کے ذریعے علامہ کی "شناخت" بھی اپنے ذہن میں محفوظ کرلی۔

علامہ نے اُن سے کہا کہ آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ اعجاز کو قرآن پڑھا رہے ہیں۔ حافظ صاحب نے اس کے جواب میں کہا "احسان اینہاں دا اے۔ سانوں ثواب دا موقع دیندے نیں" (احسان تو اِن کا ہے کہ مجھے ثواب کمانے کا موقع دیتے ہیں۔)

جس طرح معصوم بچہ اپنا کھلونا ہر ایک کو دکھا کر خوش ہوتا ہے، اسی بھولپن اور سادگی کے ساتھ حافظ صاحب نے اپنی پاکٹ بک جھٹ سے نکال کر علامہ کے ہاتھ میں دے دی کہ دیکھیے، کتنے انگریزی پڑھے لوگ قرآن پڑھ رہے ہیں۔

علامہ نے فرمایا "حافظ صاحب! آپ بڑا نیک کام کر رہے ہیں۔ اس کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو دے گا۔"

حافظ صاحب نے اس پر خوش ہو کر کہا "اسی تے چھلڑاں ای دیندے آں، گریاں تے تُسی دیندے او تاں! (ہم تو چھلکے ہی دیتے ہیں، مغز تو آپ دیتے ہیں۔

نوجوان اور سیاست

شیخ صاحب نے بتایا کہ ۱۹۲۱ء میں ایل ایل۔ بی کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے علامہ اقبال کے مشورے سے سیالکوٹ

میں وکالت شروع کر دی۔ اُن دنوں ہندوستان میں سیاسی تحریک کا بڑا زور تھا اور شیخ صاحب بھی دُوسرے نوجوانوں کی طرح اس سے متاثر تھے اور تحریکِ خلافت میں خاصی سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیتے تھے۔ ان کے والد نے علامہ سے اس کا ذکر کیا تو جواب میں فرمایا ـــــ اعجاز کو چاہیے کہ پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اس کے بعد ملک کی تحریکوں میں شامل ہو۔ خلافت کا کام کرنے سے میں نہیں روکتا کیونکہ اس کا سارا دار و مدار قلب کی اندرونی کیفیت پر ہے، مگر اُسے پہلے اپنے کام میں پُختہ ہو جانا چاہیے۔ مزید فرمایا" اس کے علاوہ خلافت کمیٹیوں کے بعض ممبر ہر جگہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر جوشیلے مسلمان معلوم ہوتے ہیں لیکن در باطن اخوان الشیاطین ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے خلافت کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے استعفےٰ دے دیا تھا۔ اس استعفے کے وجوہ اس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کیے جاتے، لیکن اگر پیش کیے جا سکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی"۔

شخصیت یا خودی کا کمال

اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۲۰ء میں علامہ بعض عزیزوں سے کچھ کبیدہ خاطر تھے۔ اس بات کا "میاں جی" کی طبیعت پر بوجھ سا تھا۔ اعجاز صاحب لاہور گئے تو اُن کی زبانی میاں جی نے علامہ کو پیغام بھیجا کہ اُن کی طبیعت اُداس رہتی ہے۔ علامہ اُن کی اُداسی کی وجہ سمجھ گئے۔ جواب میں جو خط[1]

[1] یہ خط اعجاز صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

میاں جی کو لکھا، وہ اس قابل ہے کہ حرف بہ حرف نقل کر دیا جائے ـــــ

" اعجاز کی زبانی آپ کا پیغام پہنچا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت اداس رہتی ہے۔ کئی سال ہوئے، میں نے ایک کتاب یورپ میں خریدی تھی، مگر آج تک اس کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ان تعطیلوں میں اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا آغاز اور اختتام یہ فقرہ ہے :

" میری کوئی چیز نہیں اور میرے لیے تمام اشیاء کا عدم و وجود برابر ہے۔"

یہ ساری کتاب اسی جملے کی تشریح ہے اور حقیقت میں بہت خوب ہے۔ حقیقی شخصیت یہی ہے کہ انسان اپنی اصلی حقیقت کا خیال کر کے تمام تعلقات سے آزاد ہو جائے یعنی بالاتر ہو جائے۔ نبی کریمؐ کی زندگی میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ اُن سے زیادہ اپنے عزیزوں سے محبت کرنے والا اور کون ہو گا؟ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا تھا جب آپؐ کو نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ عائشہؓ کون ہے اور ابوبکرؓ کون ہے، نہ یہ کہ محمدؐ کون ہے۔ ہمارے صوفیا نے اس کو فنا سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ یہ شخصیت یا خودی کا کمال ہے۔ اسے فنا نہیں کہنا چاہیے اور انسانی حیات کی

یہی کیفیت حیات بعد الموت کی تیاری ہے، لیکن آپ اِس نکتے کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

ہمارے عزیزوں میں جب آپس میں بگاڑ ہو جاتا ہے تو ہم جو اُن کی صلح و آشتی میں خوش ہوتے ہیں۔ ان کا بگاڑ دیکھ کر رنجیدہ اور پریشان ہوتے ہیں۔ جب اسی قسم کا بگاڑ اور لوگوں میں ہو جو عام معنوں میں ہمارے عزیز یا رشتے دار نہیں ہیں تو ہم کو کوئی رنج نہیں ہوتا اور کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ جو آدمی انسانی زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہے، اُسے معلوم ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان آپس میں عزیز رشتے دار ہیں، کیونکہ حیاتِ انسانی کی جڑ ایک ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ چند آدمیوں کے بگاڑ سے، جن کو ہم خاص طور پر اپنا رشتے دار کہتے ہیں، ہم کو رنج ہوتا ہے اور باقی لوگوں کے بگاڑ سے ہم پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ عزیز تو حقیقت میں وہ بھی ہیں۔ انسان اس فطری میلان سے مجبور ہے کہ جو آدمی خون کے اعتبار سے ہمارے قریب ترہیں اُن کو اپنا رشتے دار کہتا ہے اور جو دور ہیں، ان سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ حالانکہ خون اور زندگی میں قُرب اور بُعد، نزدیکی و دُوری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

اس سے ظاہر ہے کہ تعلقات کی وجہ سے جو پریشانی ہم کو لاحق ہوتی ہے، اُس کی بنا دراصل میں ناانصافی پر ہے۔ ناانصافی یہ کہ بعض افراد کو قربِ خونی کی وجہ سے قریب جاننا اور بعض کو بُعدِ خونی کی وجہ سے بعید جاننا، حالانکہ زندگی کی حقیقت قُرب و بُعد سے مبرّا ہے۔ کامل انسان تمام عالم کے لیے رحمت ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یوں کہیے کہ کامل انسان تعلقات سے بالاتر ہے۔"

رُوحانی اضطراب

ایک مرتبہ علامہ نے شیخ اعجاز احمد کو خط میں لکھا کہ جرمنی کے مایۂ ناز شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر نوجوانوں کے رُوحانی اضطراب اور دل بے چینی کو محسُوس کر کے اُن کو یہ پیغام دیا تھا:

Art still has Truth, Take Refuge there

"اس وقت دُنیائے اسلام کی وُہی حالت ہے جو نپولین کے وقت جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مُسلمانوں کے لیے وہی ہے جو گوئٹے نے دیا تھا۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے "Art" کی جگہ "Religion" رکھ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹ میں اطمینان و مسرّت ضرور ہے، مگر قوت نہیں۔ مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ اور توکّل

علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس قدر بھروسہ اور توکّل تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں متردّد اور پریشان نہ ہوتے تھے۔ اُن کے اندر راضی برضا رہنے کی سچ مچ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ قناعت کے ساتھ خُود داری اور صبر کے ساتھ توکّل۔ یہ اُن کے کردار کا نمایاں پہلو ہے۔ علامہ دُوسروں کو بھی "توکّل علی اللہ" کی تلقین فرماتے اور اس انداز میں نصیحت کے کلمات کہتے کہ یاس و نومیدی کی بجائے امید و رجا اور حوصلہ پیدا ہو۔

شیخ اعجاز احمد ۱۹۲۲ء میں جب انکم ٹیکس افسر مقرر ہو کر ٹریننگ کے لیے پشاور بھیجے گئے اور وہاں ایک عیسائی ٹریننگ افسر کے تعصب سے سابقہ پڑا تو انھوں نے اس افسر کے غیر ہمدردانہ اور متعصبانہ رویّے کا حال لکھ کر علامہ کو بھیجا۔ علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ــــ

رزق انسان کا عمرو زید کے ہاتھ میں نہیں۔

خُدا کے ہاتھ میں ہے۔

رزق از وے جُو مجُو از زید و عمر

مستی از مے جُو مجُو از بنگ و چرس

تمام معاملات کو اللہ کے سپُرد کرنا چاہیے اور ہر قسم کی فکر دل سے نکال دینی چاہیے۔ خدا کارساز ہے اور انسان کی

فکر اس کے لیے باعثِ آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ
مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر کیا؟ خدا تعالیٰ رزق کا کوئی اور
سامان پیدا کر دے گا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔
غرض یہ ہے کہ انسان کو اپنی صحت و حالت کے مطابق اپنے
فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے اور نتائج خدا کے
سپرد کر دینے چاہییں۔

راہبوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرح دُنیا سے بیزاری، کنارہ کشی اور جائز لذّت و آرام ترک کر دینے کے علامہ اقبال مخالف تھے۔ ان کا پیغام عمل کا پیغام ہے۔ انفس و آفاق میں غور و فکر اور تسخیرِ کائنات ــــ یہی تھی ان کے نزدیک مردِ مومن کی خصوصیت۔ یہاں تک کہ وہ اپنے عمل و کردار سے قرآن کا صرف قاری ہی نہ رہے، بلکہ خود قرآن بن جائے۔

اقبال کا توکل بے عملی کا "توکل" نہیں بلکہ فعال توکل تھا۔ ہر امکانی تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور قدرتِ کاملہ پر ایمان و ایقان۔ وہ اس پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ جب انسان عمل و تدبیر کی ہر ممکنہ کوشش کے ساتھ نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتا ہے تو پھر غیب سے اسباب و سامان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے عزیزوں کو خطوط میں وہ اپنے اس نظریے اور عقیدے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

۱۹۳۱ء میں جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے تو وہاں انھیں اطلاع ملی کہ ان کے بڑے بھائی بیمار ہیں اور بیٹوں سے

متعلق منشی طاہر دین نے لکھا کہ ان کے فیل ہو جانے کی افواہیں گرم ہیں۔ اس پر علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا ــــــ

"...... برادرِ مکرم کی طبیعت کی ناسازی کی خبر سُن کر مجھے یک گونہ فکر پیدا ہوا ہے۔ زندگی اور موت رنج و راحت سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ــــ انشاء اللہ اُن سے ملاقات ہو گی اور میں ان کو تندرست پاؤں گا۔

طاہر دین نے بکلوں کے متعلق فکر کا اظہار کیا تھا۔ اُس سے کہہ دینا چاہیے کہ فکر کی بات نہیں۔ میرے تمام معاملات جان و مال اور روپیہ اللہ کے سپرد ہے۔ جب سے میں نے ایسا کیا ہے مجھے کوئی تردد نہیں ہوتا۔ اُس کی مرضی میری مرضی ہے۔"

خوفِ خدا

شیخ اعجاز احمد نے والدۂ جاوید کے متعلق ایک ایسا واقعہ سنایا ہے جس سے اس نیک خاتون کے حُسنِ سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ انھیں کے الفاظ میں سُنیے ــــ

سردار بیگم چچی جان بڑی فراخ حوصلہ خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ کسی کی طرف سے چچا جان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ چند ہزار روپے اُن کے کسی کام کے لیے صرف کریں

چچاجان کے پاس روپیہ موجود نہ تھا۔ سردار چچی جان کو اس مطالبے کا علم ہوا تو انھوں نے دادا جان کو خط لکھا کہ اُن کا زیور فروخت کر کے مستحق ضرورت مند کو دے دیا جائے۔ اس کے جواب میں دادا جان کا جو خط آیا وہ چچا جان نے دیکھ لیا اور اس طرح انھیں اس پیش کش کا علم ہو گیا۔ علامہ نے اپنے والد بزرگوار کو لکھا کہ ــــــ

"آپ کا خط جو اعجاز کی چچی کے نام آیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اور نیز اُس نے اُس خط کا مضمون بھی سنایا ہے جو اُس نے آپ کی خدمت میں تحریر کیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وسعت اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے، مگر یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ میں اُس کا زیور لے کر ایسے کام پر صرف کروں، جس سے نہ اُسے کچھ فائدے کی توقع ہو سکتی ہے نہ مجھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنا زیور اس خیال سے نہیں دیتی کہ کل کو اسے اس کا معاوضہ ملے گا، بلکہ وہ محض اس غرض سے دیتی ہے کہ مجھ پر کوئی شخص حرف گیری نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے تو اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناخوش ہے۔ برخلاف اس کے "ناانصافی" کا مطلب خدا اور رسول کو ناخوش کرنا ہے، جس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ میں اور لوگوں کی حرف گیری آسانی سے برداشت

کر سکتا ہوں۔ خدا اور رسولؐ کی ناراضگی سے میرا دل کانپتا ہے۔"

احساسِ ندامت

اقبال کو ذاتِ رسالت مآبؐ سے جو والہانہ محبت تھی، اُس کا اظہار اُن کے کلام سے ہوتا ہے۔ اُن کا تنہا یہ شعر

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

سوزِ عشقِ نبیؐ کا آتش کدہ ہے۔

ایک مرتبہ علامہ نے اپنی چھوٹی ہمشیرہ کو خط میں لکھا کہ ــــــ

"مَیں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے۔ اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسولؐ کی میں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والدِ محترم مجھے علومِ دین ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت

کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا
کے علم میں تھا، ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا، میں نے
کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا، اس سے بڑھ کر ہونا
چاہیے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی کریم کی خدمت میں
بسر ہونی چاہیے تھی۔"

لدھیانے والی بیگم کا انتقال

اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ ہماری لاہور والی سردار چچی جان (والدہ جاوید) اور لدھیانے والی مختار چچی جان قریباً دس گیارہ سال ایک ہی مکان میں چچا جان کے ساتھ رہیں۔ ان کے درمیان سوکنوں والا تنازعہ کبھی میرے علم میں نہیں آیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ چچا جان دونوں میں انتہائی عدل مدِ نظر رکھتے تھے اور ایک کو دوسری پر کسی قسم کی فوقیت نہ دیتے تھے۔ اس معاملے میں قدرت نے بھی اُن کی مدد کی، کیونکہ دس گیارہ سال تک تو دونوں میں سے کسی کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں دونوں ہی امید سے ہوئیں۔ وقت قریب آنے پر چچا جان نے سردار چچی کو میری والدہ صاحبہ کے پاس سیالکوٹ بھیج دیا اور مختار چچی لدھیانہ اپنے میکے چلی گئیں۔ ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو سیالکوٹ میں جاوید پیدا ہوا۔ لدھیانے سے بھی خیریت کے خط آ رہے تھے اور توقع تھی کہ اسی مہینے کے آخر میں وہاں سے بھی خوشی کی خبر آئے گی۔ میں ایک کام کے

سلسلے میں چچا جان کے پاس لاہور گیا ہُوا تھا کہ لُدھیانے سے چچی مختار کی تشویش ناک علالت کی اطلاع آئی۔ انھیں نمونیا ہو گیا تھا۔ چچا جان بہت متفکر ہُوئے اور مجھے ساتھ لے کر لُدھیانے پہنچ گئے۔

نمونیے نے چچی مختار کو سخت کمزور کر دیا تھا اور وہ وضعِ حمل کی زحمت برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ اس پر ستم یہ کہ دردِ زہ بند ہو گیا جو بڑی خراب علامت تھی۔ آخر چچا جان نے ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، زچہ کی جان بچانے کی کوشش کریں اور بچے کا خیال نہ کریں۔ لیکن ڈاکٹروں کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہُوئی اور اُس نیک بی بی نے جان دے دی۔ وفات سے پندرہ منٹ پہلے چچا جان نے اُن کو دیکھا اور حال پُوچھا تو انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ اچھی ہُوں۔ حالانکہ اُس وقت ان کا وقت بالکل قریب تھا اور اُن کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ اس دردناک وفات نے چچا جان کے قلب پر بڑا اثر کیا۔ ان کے کرب و بے چینی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وفات کے دُوسرے دن لُدھیانے سے میرے ابّا جان کو لکھا کہ ــــ

"کل آپ کی خدمت میں تار دے چکا ہوں۔ تقدیرِ الٰہی کا مقابلہ تدبیرِ انسانی سے نہیں ہو سکتا۔ مرحومہ کی موت کا منظر نہایت درد انگیز تھا۔ خدا تعالیٰ اُس کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ بہترین ڈاکٹروں کا علاج تھا، مگر اللہ کے علم میں مرحومہ کی زندگی کے دن پُورے ہو چکے تھے۔ ...

کی حالت میں اُس کی حالت اس قدر بے چارگی اور بے کسی
کی تھی کہ میرے لیے اس کی طرف نگاہ کرنا بھی مشکل تھا اور
میرا قلب سخت رقیق ہو گیا۔"

مزید لکھا کہ ــــ

"ایک معمولی انسان کو دنیا میں لانے کے لیے، جو
پچاس ساٹھ سال سے زیادہ اس دارِ فانی میں نہیں ٹھہرتا،
نیچر اس قدر تکلیف ایک ضعیف عورت کو دیتی ہے۔"

اس خط میں سردار چچی کے نام پیغام تھا کہ انھیں مرحومہ کی خالہ زاد بہنوں کو ہمدردی کا خط لکھنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ میں تا عمر تمھاری بہن ہوں اور ہمیشہ تم کو ایسا ہی سمجھوں گی۔ سردار چچی جان نے نہ صرف ایسا خط ہی لکھا بلکہ پھر زندگی بھر اس عہد کو نبھایا۔

رسمِ قُل ادا ہو جانے کے بعد میں اور چچا جان لاہور واپس آ گئے۔ مرحومہ کے بھائیوں نے اُن کا تمام زیور اور سامان واپس کر دیا۔ ہر چند چچا جان نے کہا کہ شریعت کے رُو سے اس کے بیشتر حصے کے وارث مرحومہ کے بھائی بہنیں ہیں ــــ مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔

لاہور پہنچ کر اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ابا جان کو لکھا کہ ــــ

"اب ارادہ ہے کہ یہ ترکہ اُس کی کسی یادگار کی صورت
میں صرف کیا جاوے۔ کچھ روپیہ میں اور اپنی طرف سے اس

میں اضافہ کر دوں گا۔ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو بہت اچھی صورت ہو جائے گی"۔

چچا جان کی طبیعت بہت دنوں تک نہایت پریشان رہی۔ مرحومہ کی لوحِ مزار تیار کرا کر لاہور سے بھجوائی، جس پر حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ کندہ تھا ــــ

اے دریغا! ز مرگِ ہم سفرے
دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخن پاک مصطفیٰ آورد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود
بشہادت رسید و منزل کرد

۱۳۴۳ ھ

یہ قطعہ لدھیانے کے قیام کے دوران میں ہی وفات کے دوسرے یا تیسرے دن کہا تھا۔ جس کاغذ پر لکھا تھا، وہ میرے سپرد کر دیا تھا کہ لاہور پہنچ کر انھیں دے دوں۔

"سرودِ رفتہ" مرتبہ غلام رسول مہر میں یہ قطعہ شائع ہوا ہے، مگر اس میں دو تین غلطیاں ہیں جن کی تصحیح ضروری ہے اولاً یہ کہ تاریخ وفات ۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء لکھی گئی ہے۔ یہ درست نہیں، اصل تاریخ وفات ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء بروز سہ شنبہ

ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کتابت کے وقت "۲۱" کا "۱" لکھنے سے رہ گیا ہو یا سنگسازی اور طباعت کے مرحلوں میں یہ عدد اُڑ گیا ہو۔ دُوسرے ہجری سن وفات ۱۳۴۲ء لکھا گیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ تاریخ وفات ۲۱ ربیع الاوّل ۱۳۴۳ھ ہے۔ ان دو فروگزاشتوں کے علاوہ قطعے کا آخری مصرعہ "سرود رفتہ" میں یُوں درج ہُوا ہے ـــ

"بہ شہادت رسید و منزل کرد"

جس سے سالِ وفات ۱۳۴۸ھ نکلتا ہے، حالانکہ صحیح مصرعہ ـــ

"بشہادت رسید و منزل کرد"

ہے، جس سے ۱۳۴۳ مجموعۂ اعداد برآمد ہوتا ہے۔ "بشہادت" کی جگہ "بہ شہادت" چھپ جانے سے پانچ (۵) کا اضافہ ہوگیا۔ جس نے سن وفات کی صحت میں خلل پیدا کردیا۔

انصاف یا فضل

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شیخ اعجاز احمد کی ایک پھوپھی نے کسی سلسلے میں علامہ کے سامنے اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کا ذکر کرتے ہُوئے کہا کہ وہ منصف ہے اور انصاف کرے گا۔

علامہ نے اس پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمارے ساتھ اپنی صفتِ عدل کا مظاہرہ نہ کرے کہ ہم اُس کے انصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے البتہ

وہ ہم پر اپنا فضل و رحم فرمائے!

علامہ نے کتنی سچی اور اچھی بات کہی ہے۔ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی میزانِ عدالت جب قیامت میں کھڑی ہوگی تو بڑے بڑے اولیاء اور اصفیاءؔ کو پسینہ آجائے گا۔ اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے سبب بخشا جاؤں گا۔

میرحسن ہال

علامہ اقبال خود نگر نہیں، خود شناس تھے۔ انھیں اپنی شخصیت کا احساس اور اپنی خودی کا عرفان تھا۔ اس لیے اضافی نسبتوں کی طرف اُن کا میلان نہیں رہا۔ انھیں اس کی کبھی خواہش نہیں ہوئی کہ کسی انجمن یا ادارے میں انھیں کوئی عہدہ دیا جائے۔ جلسوں کی صدارتوں کا بھی انھیں شوق نہ تھا۔ لوگوں کے اصرار پر جب کبھی انھیں کسی اجتماع یا کانفرنس کی صدارت کرنا پڑی تو اہلِ نظر نے محسوس کیا کہ وہ اسے ذاتی اعزاز سمجھ کر نہیں، محض قومی خدمت جان کر ادا کر رہے ہیں۔

ایک بار یہ تجویز ہوا کہ اقبال کے نام سے ایک فوجی اسکول قائم کیا جائے۔ علامہ نے تجویز پیش کرنے والے فوجی افسر کو جواب دیا کہ ایک شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو منسوب اور موسوم کرنا موزوں نہیں ہے اور پھر خود تجویز کیا کہ اس اسکول کا نام "ٹیپو فوجی اسکول" رکھا جائے۔

اعجاز صاحب کا بیان ہے کہ ایک رسمِ افتتاح انجام دینے کے لیے

انھیں اپنے منتخب نہ کیے جانے کا ضرور ملال ہوا۔ سیالکوٹ میں ایک انجمن اسلامیہ ہے' جو دوسرے قومی کاموں کے علاوہ ایک ہائی اسکول بھی اپنے اہتمام سے چلاتی ہے۔ جب اس اسکول کی نئی عمارت بن کر تیار ہوئی تو انجمن کی مجلس منتظمہ نے اسکول کے ہال کا نام علامہ اقبال کے استاد مولانا میر حسن کے نام پر "میر حسن ہال" رکھا۔ اس ہال کی رسم افتتاح کے لیے انجمن والوں نے حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم کو دعوت دی ——— وزیر صاحب تشریف لائے اور ان کے ہاتھوں یہ رسم انجام کو پہنچی۔ علامہ اقبال کو انجمن والوں کی یہ حکام پرستی پسند نہیں آئی۔ انھوں نے ایک صحبت میں اپنے اس جذبے کا اظہار بھی کر دیا ——— فرمایا کہ انجمن والوں نے میرے استاد کے نام سے ہال منسوب کیا۔ مناسب یہ تھا کہ ان کا شاگرد اس کا افتتاح کرتا اور لوگوں کو بتاتا کہ مولانا میر حسن کیا تھے؛ مگر انجمن والوں نے حکام پرستی کے شوق میں حکومت کے وزیر کا اس کے لیے انتخاب کیا۔

لڑکیاں باعثِ رحمت

شیخ اعجاز احمد اس واقعے کے راوی ہیں کہ وہ اپنی چچی (والدۂ جاوید) کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں منیرہ کھیلتے کھیلتے اندر آگئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی چچی نے منیرہ سے کہا' بیٹی! ادھر آ۔ میں تیرے کنگھی کر دوں۔ منیرہ کو بالوں میں کنگھی کرانے سے بڑی چڑ تھی۔ وہ کنگھی کرانے سے بچنے کی خاطر باہر بھاگنے لگی' مگر ماں نے اُسے پکڑ کر بٹھا لیا اور بالوں کو

کنگھی سے سلجھانا اور سنوارنا شروع کر دیا۔ اس پر منیرہ رونے لگی۔

علامہ اقبال بیٹی کے رونے کی آواز سن کر اندر آ گئے اور منیرہ کے رونے کا سبب پوچھنے لگے۔ علامہ کی بیگم نے کہا کہ بالوں میں کنگھی کرانا نہیں چاہتی۔ علامہ نے فرمایا، کنگھی کرائے یا نہ کرائے، مگر اس کو رونے نہ دیا کرو۔ میں اس کے رونے کی آواز نہیں سن سکتا۔ دل کو تکلیف ہوتی ہے۔

"روزگارِ فقیر" کی پہلی جلد میں اس واقعے کا ذکر آ چکا ہے کہ سید راس مسعود کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو علامہ اقبال نے قطعہ کہا اور اس کے چوتھے شعر میں لڑکی کے وجود کو "باعثِ برکاتِ لامحدود" فرمایا۔ شیخ صاحب کی تیسری لڑکی کی ولادت پر انھیں خط لکھا کہ ــــــ

"آج بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ تمھارے ہاں ایک اور لڑکی ہوئی ہے۔ لڑکیوں کی افزائش رزق کی افزائش ہے۔ کیا عجب، خدا تعالیٰ تمھارے رزق میں بھی توسیع کر دے۔"

لڑکیوں پر اس شفقت و محبت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقدس اسوہ کی جھلک پائی جاتی ہے۔

○

لندن میں

۱۹۳۱ء میں جب لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو علامہ اقبال نے بھی اس میں شرکت کی۔ اُن دنوں ہندوستان کے غیر مسلم اخبارات گول میز کانفرنس کی خبریں اس انداز میں پیش کرتے تھے کہ مسلم نمائندوں کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف ہندو مسلم مصالحت کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ ساتھ ہی مہاتما گاندھی کے دورے، استقبال اور نقل و حرکت کی خبروں کو خوب بڑھا چڑھا کر، بلکہ بعض اوقات گھڑ کر پیش کیا جاتا۔ مقصود یہ تھا کہ دنیا ان خبروں کو پڑھ کر یہ اثر قبول کرے کہ عزیزِ قوم گاندھی جی کے لیے فرشِ راہ بنی ہوئی ہے۔

علامہ اقبال نے لندن سے ماہ اکتوبر ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ــــــ

"ہندوستان سے اخبار آتے ہیں۔ عجیب و غریب ہیں ان میں چھپتی ہیں مثلاً "پرتاپ" میں لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی کو شاہی محل میں کمرہ مل گیا ہے اور جب وہ بازار سے گزرتے ہیں تو ہزاروں کا ہجوم ان کے گرد ہوتا ہے۔ حالانکہ حال یہ ہے کہ ان کے آنے کا میاں اُلٹا اثر ہوا ہے۔ میں نے اسی واسطے لکھا تھا کہ غیر مسلم ذرائع سے جو اخبار آئیں اُن پر اعتبار نہ کیا جائے۔ مزید لکھا کہ مسلم ڈیپوٹیشن متحد ہے۔ گفتگو سے معاملات

کے خاتمے کا الزام ہندوؤں یا سکھوں کے سر ہے۔"

ایک دُوسرے خط میں تحریر فرمایا ــــــ

"ہندوؤں نے یہاں بھی میرے ایڈریس[1] کے متعلق بعض انگریزوں سے پروپیگنڈا کرایا ہے۔ میں نے اس کا دنداں شکن جواب اخبار "ٹائمز" میں شائع کرا دیا ہے۔"

علامہ اقبال جن دنوں لندن میں قیام فرما تھے۔ اس دوران میں ۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو اُنھوں نے انڈیا سوسائٹی میں "فلسفہ اور شعر" پر بڑے معرکے کا لیکچر دیا۔ اس کے بعد ۷ نومبر کو مسلمان طلبا نے اُن کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ والڈروف ہوٹل کی اس استقبالیہ دعوت میں ہندوستان اور انگلستان کے بہت سے علما و مشاہیر موجود تھے۔ پروفیسر نکلسن اور دُوسرے علماء نے اس موقع پر علامہ کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ علامہ اقبال نے اس موقع پر جو معرکہ آرا تقریر کی، اُس کے دو اقتباسات حسب ذیل ہیں:

فارسی زبان کے استعمال کے متعلق فرمایا: ــــــ

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنی آواز ہندوستان سے باہر خصوصاً ایران تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر یہ خیال درست نہیں ہے۔ اگرچہ میرا پیغام یعنی پیغامِ عمل تمام دُنیا کے لیے ہے اور اہلِ ایران میرے دائرہ سامعین سے خارج نہیں ہیں مگر میرے کلام کے اوّل مخاطب ہندوستان ہی کے خواص

---

[1] خطبہ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ الٰہ آباد

تھے۔ کیونکہ میں اپنا پیغام اوّل مرحلے میں صرف خواص تک
محدود رکھنا چاہتا تھا اور اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ پہلے خواص
کا طبقہ میرے پیغام کو سنے اور اپنی ذہنی استعداد کی بناء پر
اُسے صحیح طور پر سمجھے اور اُس کو اچھی طرح اخذ کرنے کے بعد
عوام تک پہنچائے۔ دُنیا کی تاریخ میں اکثر یوں بھی ہوا ہے
کہ دقیق خیالات اور باریک نکات جب عوام پر بغیر کسی واسطے
کے ظاہر کیے گئے تو کسی نے اُن کو سمجھا اور کسی نے نہ سمجھا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ متکلم کی بات اور اُس کا مفہوم و مطلب کچھ کا کچھ
ہو گیا۔ مجھے اس بات سے مسرت ہے کہ جہاں تک مجھے
معلوم ہے میں اپنے ہم عصروں کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا
اور میرے مخاطبین نے میرے کلام کی رُوح تک پہنچنے میں
ایسی ٹھوکر نہیں کھائی جس سے گوہرِ مقصود گم ہو جائے"۔

فلسفۂ خودی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ـــــ

"جب سے دیارِ مغرب میں اقتصادی انقلاب آیا
ہے، کارخانہ داری کے نظام نے فردِ بشر کو انفرادی حیثیت
سے بہت حقیر اور بے مایہ بنا دیا ہے اور وہ محسوس کر رہا ہے
کہ وہ گویا ایک پرکاہ ہے جس کو سوسائٹی کا بے پناہ سیلاب
بہائے چلا جا رہا ہے"۔

علامہ نے فرمایا ــــــ

"اِن حالات پر غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا

کہ اس دَور میں انسان کو ایک ایسے جام کی ضرورت ہے جو

اُس کی افسردگی اور اُس کے احساسِ کمتری کو دُور کر کے

اُس کے جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دے، جس سے

اُس کے قدم یقین اور خود اعتمادی کی چٹان پر محکم ہو جائیں

اور وہ اس راز سے آگاہ ہو جائے کہ اس کو وُہ کچھ عطا ہُوا

ہے جو شمس و قمر کو بھی نہیں ملا۔ یعنی شعور Consciousness

اور شخصیت Personality

اگرچہ وُہ کائنات کے مقابلے میں ایک ذرہ ہے

مگر اس ذرّے کے اندر ایک علیحدہ دُنیا موجود ہے۔ ذی

رُوح اور ذی شعور ہونے کی حیثیت سے انسان کا فرض ہے

کہ وہ اس دُنیا کو اپنے فکر اور عمل سے آباد کرے۔"

۹ نومبر ۱۹۳۱ء کو لی سی۔ ایم کلب میں انگریز خواتین کی جانب سے علامہ کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا۔

علامہ اقبال لندن سے جو خطوط لکھا کرتے تھے، اُن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جس طرح وُہ اپنے بچّوں کو پیار اور احباب و اعزہ کو سلام لکھتے تھے، اُسی طرح اپنے دونوں نوکروں (علی بخش اور رحمان) کو بھی ضرور سلام لکھتے۔

بعض نو مُسلم

"روزگارِ فقیر" جلد اوّل میں جبن سنگھ بیدی صاحب اور علامہ اقبال کی ملاقات کا واقعہ درج ہے۔ انھوں نے شیخ اعجاز احمد صاحب سے چونیاں میں مل کر زبانی کہا تھا کہ میں علامہ اقبال سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس ملاقات کا آپ انتظام کر دیں۔ میں مسلمان ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس کے بعد بیدی صاحب نے پھر ایک خط لکھا، جس میں اپنی اس خواہش کی یاد دہانی کے علاوہ اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کا ذریعۂ معاش ختم ہو جائے گا۔ اگر اس کا کچھ انتظام ہو سکے تو کیا جائے۔ اعجاز صاحب نے بیدی صاحب کو خط کے جواب میں لکھا کہ مسلمانوں میں کوئی ایسی منظم جماعت نہیں ہے جو نو مسلموں کے معاش و روزگار کا انتظام کرتی ہو۔ انھوں نے بیدی صاحب کا خط اور اپنے جواب کی نقل علامہ کی خدمت میں لاہور بھیج دی۔ علامہ نے اس کا جواب دیا:

> "..... باقی رہا بیدی صاحب کا معاملہ سو تم نے اُن کو ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں کوئی منظم جماعت ایسی نہیں کہ نو مسلموں کے لیے کوئی انتظامِ معاش کر سکے۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے پنجاب کے ایک مقام سے خبر آئی کہ کئی ہزار مذہبی سکھ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ

اُن کے لیے زمین کا انتظام کر دیا جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس تین چار معزز سکھ اور ہندو میرے پاس آئے کہ اگر اُن کی ملازمت کا انتظام ہو جائے تو وہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ غرض، بالعموم اس قسم کے حالات میں دُنیوی محرکات عمل کرتے ہیں۔ بہرحال اگر بیدی صاحب کی توقعات کا حال معلوم ہو تو میں یہاں کسی انجمن سے گفتگو کروں۔ اُن کے خط میں مطالبات کا کہیں ذکر نہیں۔ عام طور پر اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ تبدیلیِ مذہب سے کسی کا مقصود محض منفعتِ مادّی ہے، تو وہ اسے نہایت مکروہ جانتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ اُن کے سیاسی زوال کے اوقات میں ہُوا۔ حکومت کے عروج کے زمانے میں اسلام نہیں پھیلا۔ مگر اس بات کا کیا علاج کیا جائے، اس ملک میں مسلمان نہایت افلاس زدہ ہیں۔ خود موجودہ مسلمان قوموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ تاہم جوشِ تبلیغ کسی حد تک مسلمانوں میں موجود ہے۔ یہی حال میں نے یورپ میں دیکھا ہے۔ اسلام کے متعلق ان کی رازجوئی روز بروز ترقی کر رہی ہے، مگر مسلمانوں میں استطاعت اس قدر نہیں ہے کہ

وہ یورپ میں کلچرل اور مذہبی مشن بھیج سکیں۔

آنکھ کا عارضہ

علامہ اقبال کی ایک آنکھ بچپن ہی سے کمزور تھی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے تو طبی بورڈ نے آنکھ کی بینائی کمزور ہونے کے سبب اُن کو سرکاری ملازمت میں لیے جانے کی سفارش نہیں کی۔ یہ بظاہر ایک طرح کی ناکامی تھی۔ مگر علامہ کے مستقبل کے تابناک اور کامیاب ہونے کا پیش خیمہ تھی۔ سرکاری ملازمت میں وہ کمشنر اور گورنر بن سکتے تھے، مگر "ترجمانِ حقیقت" اور "حکیم مشرق" غالباً نہ بن سکتے۔

زندگی کے آخری سالوں میں آنکھ میں پانی اُترنا شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں موتیابند کی اس قدر شدت ہو گئی کہ معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ ڈاکٹر متھرا داس موگا والے آنکھوں کے علاج میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ اس شہرت، عزت اور فنی مہارت کے باوجود بڑے خلیق اور وضع دار تھے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب سے اُن کے تعلقات تھے۔ شیخ صاحب کے ایماء پر ڈاکٹر صاحب علامہ کی کوٹھی پر خود ہی تشریف لے آئے اور آنکھوں کا بڑی تفصیل

؎ کلچرل سے رقاصاؤں اور ایکٹرسوں کے وفود ہرگز مراد نہ لیے جائیں کہ علامہ مسلمانوں کے معاشرے میں اس لغویت کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ (ف۔ ی)

کے ساتھ معائنہ کیا۔

ڈاکٹر متھراداس نے رائے ظاہر کی کہ موتیا بڑی تیزی سے اُتر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ مارچ ۱۹۳۸ء میں آپریشن کے لائق ہو جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ فروری ۱۹۳۸ء میں وہ پھر معائنہ کریں گے اور اطمینان دلایا کہ جب بھی آنکھ آپریشن کے لائق ہو جائے گی، وہ خود نہایت عمدگی کے ساتھ آپریشن کریں گے اور امید ہے کہ پوری بصارت عود کر آئے گی۔

علامہ نے شیخ صاحب کو ڈاکٹر متھراداس کی رائے سے مطلع کرتے ہوئے لکھا کہ ــــــ

"ڈاکٹر صاحب نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں اور میں خوش ہوں کہ تم اپنے تعلقات کے لیے ایسے بااخلاق آدمیوں کا انتخاب کرتے ہو۔"

چونکہ ۱۹۳۸ء کے شروع ہی سے علامہ پر دمے کے شدید دورے پڑنے لگے لہٰذا آپریشن ستمبر ۱۹۳۸ء تک ملتوی کر دیا گیا، مگر ستمبر کے آنے تک وہ آنکھیں قیامت تک کے لیے بند ہو گئیں۔

ذوق وشوق اور خشیت

علامہ اقبال حج بیت اللہ اور زیارت روضہ نبویؐ کی بڑی تمنا رکھتے تھے مدینے اور مدینے والےؐ کا نام سن کر اُن کی آنکھیں بے اختیار نم ناک ہو جاتیں ۱۹۳۶ء

میں بہاولپور کے ایک پیر صاحب جن سے علامہ کے مراسم تھے، حج کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہ جو امیر مینائی نے کہا ہے ـــــ

جب مدینہ کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے یہ پہنچا، میں رہا جاتا ہوں

تو پیر صاحب کے سفرِ حرمین شریفین کی تیاری کو دیکھ کر یہ شوق اور تیز ہو گیا۔ بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا ـــــ طبیعت ذرا اچھی ہوتی تو پیر صاحب کے ساتھ حجاز جانے کا اچھا موقع تھا۔ پھر کہا عراق ہو کر بھی لوگ حجاز جاتے ہیں، مگر میں نے دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ اس راستے میں اور دشواریاں ہیں۔ علامہ کی بہن یعنی اعجاز صاحب کی پھوپھی نے کہا ـــــ عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں میں پانی بھی تو اتر رہا ہے۔ ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اللہ خیر سے رکھے، اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جائیے گا۔ اس پر بڑے دردانگیز، مگر پُرشوق لہجے میں فرمایا ـــــ

"آنکھوں کا کیا ہے۔ آخر اندھے بھی تو حج کرنے آتے ہیں۔"

اتنا کہنے کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔ گویا کہ ایک ایک آنسو مولانا جامی کے انداز میں زبانِ حال سے کہہ رہا تھا ـــــ

نسیما! جانبِ بطحا گزر کن
ز احوالم محمد را خبر کن!

وصیت

جنوری ۱۹۳۴ء میں علامہ اقبال کی خطرناک علالت کا آغاز ہوا، جو علاج معالجے کی تمام تدبیروں کے باوجود آخرکار جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس بیماری کے دوران میں اس سانحے سے علامہ کو دوچار ہونا پڑا کہ ۱۹۳۵ء میں اُن کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت جاوید اور منیرہ دونوں نابالغ تھے۔ علامہ کی مسلسل علالت، پھر کم سن بچّوں کا بے ماں کے رہ جانا۔ ان حالات کا اندازہ کر کے انھوں نے جو وصیت نامہ مرتب کیا وہ بجا طور پر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی نقل اس کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔

اس وصیت نامے میں جن اصحاب کو "ولی" مقرر کیا گیا تھا، اُن میں نابالغوں کے حقیقی ماموں، خواجہ عبدالغنی بھی شامل تھے۔ اُن کا ۱۹ مئی ۱۹۳۷ء کو انتقال ہو گیا۔ علامہ نے سید راس مسعود کو لکھا کہ خواجہ عبدالغنی مرحوم کی جگہ وہ اُن کو ولی مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ سید صاحب نے مشورہ دیا کہ میں چونکہ لاہور میں نہیں رہتا، اس لیے میری "ولایت" اس معاملے میں مفید و کارآمد ثابت نہیں ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے وصیت نامے میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اور خواجہ صاحب مرحوم کی جگہ کسی دوسرے شخص کو ولی مقرر نہیں کیا گیا۔

"ذکرِ اقبال" میں ۱۹۳۶ء میں ایک اور وصیت کیے جانے کا جو ذکر کیا گیا ہے، شیخ اعجاز احمد کہتے ہیں، وہ درست نہیں ہے۔ اُن کا بیان ہے—

"وفات کے دوسرے دن یعنی ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

کو چودھری محمد حسین صاحب، منشی طاہر الدین صاحب اور میں

سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں گئے۔ اُن دنوں سب رجسٹرار

میاں امیر الدین صاحب تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء والی

وصیت ہمارے حوالے کر دی۔ اس وصیت کی بنا پر پہلے

ہم تینوں اور پھر منشی طاہر الدین کے بعد میں اور چودھری

محمد حسین صاحب اس فرض کو ادا کرتے رہے۔"

علامہ کی صحت

جوانی میں علامہ اقبال کی صحت بظاہر اچھی نظر آتی تھی، مگر اُن کے برادر زادے شیخ اعجاز احمد کہتے ہیں کہ انھوں نے جب سے ہوش سنبھالا، علامہ کو کسی نہ کسی مرض میں مبتلا پایا۔ مزاج بلغمی تھا، تبخیر معدہ کی اکثر شکایت رہتی۔ جب وہ جوان تھے تو اُسی زمانے میں کبھی کبھار دردِ گردہ کی شکایت ہو جاتی۔ یہ مرض انھیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملا تھا۔ (غالباً) ۱۹۲۸ء میں علامہ کو دردِ گردہ کے شدید دورے سے دوچار ہونا پڑا۔ بڑی سخت تکلیف اُٹھائی۔ اسی حالت میں حسبِ ذیل دعائیہ اشعار کہے۔ جو روزنامہ "انقلاب" میں شائع ہوئے تھے:

وہ مرا فرصت تو حق دوسہ روزے دگرے

کہ دریں دیر کہن بندۂ بیدار کجاست؟

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست؟
اندریں عصر کہ "لا" گفت من "اِلّا" گفتم
ایں چنیں بندۂ رہ بیں بہ شبِ تار کجاست؟
حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے می خواہد
ورنہ مارا بہ جہانِ تو سروکار کجاست؟

حکیم عبدالوہاب صاحب دہلوی جو حکیم نابینا کے لقب سے مشہور تھے، اُن کے علاج سے علامہ کو اتنا فائدہ ہوا کہ پھر نو سال (۱۹۳۷ء) تک گُردے میں ذرا سی بھی کسک محسوس نہیں ہوئی، مگر "صاحبِ درد" ہونا علامہ کی قسمت میں لکھا تھا۔ دردِ گُردہ گیا تو اُس کی جگہ دردِ نقرس نے لے لی، جو پاؤں کے انگوٹھے کے جوڑ میں ہوتا تھا۔ اُس کا دورہ جب بھی پڑتا، علامہ کے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا۔ ایک مرتبہ گرمی کی تعطیلات میں حسبِ معمول سیالکوٹ تشریف لائے اور وہاں دردِ نقرس شروع ہو گیا۔ درد کی وہ شدت کہ پُوری رات کرب و بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جاتی۔ پینے والی دواؤں کے علاؤہ ڈاکٹر نے ایک لوشن بھی دیا، جس میں لنٹ (Lint) کی پٹّی آلودہ کر کے درد کی جگہ پر رکھی جاتی۔ اِس عمل سے قدرے تسکین ہوتی۔ خدا خدا کر کے کئی دن کی تکلیف اور علاج معالجے کے بعد افاقے کی صورت نظر آئی۔

علامہ کا گلا اکثر خراب رہتا۔ اعجاز صاحب کے بقول علاج کرانے میں

اُن کے معالجوں اور تیمارداروں کو تین دقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک تو یہ کہ دوا اگر بدذائقہ یا ناگوار بُو والی ہوتی تو علامہ اُس کو پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ استعمال کرنے سے جی چراتے تھے۔ دُوسرے جو لوگ اُن سے ملنے کے لیے آتے، وہ کوئی نہ کوئی مجرّب اور آزمُودہ نُسخہ ضرُور بتاجاتے۔ علامہ ان نسخوں کو بھی استعمال فرمالیتے۔ تیسری مشکل یہ تھی کہ طبیعت پرہیز کی پابندی سے کتراتی تھی۔ اس طرح باقاعدگی کے ساتھ مسلسل علاج معالجہ نہ ہوسکتا تھا۔

جنوری ۱۹۳۴ء میں یہ واقعہ بلکہ حادثہ پیش آیا کہ میٹھی عید کے موقع پر علامہ اقبال نے دہی ڈال کر سویّاں کھالیں۔ جس سے شدید نزلے اور کھانسی میں مبتلا ہوگئے۔ یہاں تک کہ گلا بھی بیٹھ گیا اور بات کرنا مشکل ہوگیا۔ ہر قسم کے علاج ہوئے۔ طرح طرح کی تدبیریں کیں، مگر میر تقی میرؔ کے بقول —

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا

جب کوئی علاج کارگر نہ ہوسکا تو آخر میں حکیم نابینا سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو ہلکے دمہ کی شکایت ہے۔ اس کے علاوہ دل اور جگر صحیح طور پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ اُن کے علاج سے خاصا افاقہ ہوگیا، مگر آواز کی حالت بدستور رہی۔ ۱۹۳۵ء میں بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں برقی علاج بھی کرایا لیکن آواز نہیں کھُلی۔

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء ان دو سالوں میں عام صحت یُوں تو اچھی معلوم ہوتی تھی، لیکن اعضاء رئیسہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتے جارہے تھے۔ خاص طور سے قلب کی حالت

غیر تسلی بخش تھی۔ ۱۹۳۶ء کے آخری مہینوں میں ضیق النفس کی شکایت زیادہ ہونے لگی۔ تھوڑی دور چلنے پھرنے سے سانس پھول جاتا اور دم چڑھنے لگتا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حکیم نابینا صاحب نظام دکن کے بلاوے پر حیدر آباد تشریف لے گئے تھے۔ علامہ اقبال وہاں اپنے ایک دوست کو اپنی بیماری کی کیفیت لکھ کر بھیج دیتے اور وہ حکیم صاحب سے دوائیں لے کر بھیج دیتے۔ جب حکیم صاحب حیدر آباد دکن سے دلی واپس آگئے تو اپریل ۱۹۳۷ء میں علامہ مرحوم حکیم صاحب کو نبض دکھانے کے لیے دلی تشریف لائے اور افغان قونصل خانے میں اپنے دوست سردار صلاح الدین سلجوقی کے ہاں قیام کیا۔ اعجاز احمد صاحب ان دنوں دلی میں سب جج کی حیثیت سے متعین تھے۔ حکیم صاحب کو نبض دکھانے کے بعد یہ بات طے پائی کہ علامہ اپنی بیماری اور مزاج وطبیعت کا حال اعجاز صاحب کو لکھ کر بھیجتے رہیں گے اور وہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اور کیفیت بیان کر کے دوائیں لے کر پارسل کے ذریعے لاہور روانہ کرتے رہیں گے۔ چنانچہ اپریل سے لے کر ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء تک اس پروگرام پر عمل ہوتا رہا۔ حکیم صاحب نے علامہ کو پورے طور پر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ لکھنے پڑھنے تک کی ممانعت تھی۔ اس لیے علامہ کسی دوسرے شخص سے اپنی صحت و مرض کی کیفیت پوری تفصیل کے ساتھ لکھوا کر بھیجتے۔ اپنے خطوں میں علامہ تاکید کے ساتھ لکھواتے کہ ——

"ایک ایک بات حکیم صاحب سے گزارش کر کے اُن کا جو جواب ہو، مجھے اس سے مطلع کریں۔ وہ جو کچھ فرمائیں اُسے

نوٹ کرتے جائیں۔"

دلّی سے دوائیں بڑی باقاعدگی کے ساتھ بھیجی جاتی رہیں اور اُن سے علاّمہ کو افاقہ بھی ہُوا۔ ایک خط میں اعجاز صاحب کو لکھا ——

"حکیم صاحب کی دواؤں نے بہت فائدہ پہنچایا ہے
حکیم صاحب طبیب ہونے کے علاوہ درویش بھی ہیں اور
مجھے ان کی یہ ادا نہایت پسند ہے۔"

—— لیکن ——

یہ فائدہ عارضی ثابت ہُوا۔ ۱۹۳۸ء کے شروع ہوتے ہی دمہ کے شدید دورے پڑنے لگے۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ طبیعت نڈھال رہنے لگی۔ یہ عارضی افاقہ دراصل سنبھالا یعنی افاقۃ الموت تھا۔ خود علامہ کے اپنے قول کے مطابق ——

"تقدیرِ الٰہی کا مقابلہ تدبیرِ انسانی سے نہیں ہو سکتا۔"

اللہ تعالیٰ کے علم میں اُن کی زندگی کے دن پُورے ہو چکے تھے۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب "کل من علیہا فان" کا ربانی قانون پُورا ہو کر رہا

انا للہ وانا الیہ راجعون !

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند

۱۳۵۷ھ میں علامہ اقبال کی جب وفات ہوئی تو شعراء کرام نے سینکڑوں تاریخیں کہیں۔ ہر شاعر نے اپنے ذوق، جستجو اور استطاعت کے مطابق بہتر سے بہتر مادۂ تاریخ نکالا۔ اخباروں اور رسالوں میں مہینوں تک تعزیتی مضامین، نظمیں اور قطعے آتے رہے، مگر علامہ کے اپنے کلام سے جو تاریخ وفات نکلی، وہ اپنا آپ ہی جواب ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہیے، اشارۂ غیبی اور نوائے سروش ہے۔

۱۹۳۳ء میں علامہ نے افغانستان کا سفر کیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ان کی مثنوی "مسافر" شائع ہوئی۔ یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں اس مثنوی کے ساتھ ایک اور مثنوی ــــ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ــــ شامل کر کے دونوں مثنویاں اکٹھی شائع کی گئیں۔

اعجاز صاحب راوی ہیں کہ ــــ "۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے، اُن کے دوست حفیظ ہوشیارپوری، جو اِن دنوں ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہیں، اپنے مرحوم بھائی عبدالرشید صاحب راحل کے ساتھ ہوشیارپور میں علامہ کی مثنوی "مسافر" پڑھ رہے تھے۔ حفیظ صاحب بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ تاریخ گوئی میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ جب "مسافر" میں "مناجات مردِ شوریدہ در ویرانۂ غزنی" پڑھتے پڑھتے اس شعر پر پہنچے ــــ

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند
آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

تو انھیں خیال آیا کہ مصرعۂ اولیٰ کے اعداد ۱۳۰۰ (تیرہ سو) سے زائد معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیں اس مصرعے سے کون سا سنہ ہجری نکلتا ہے۔ اُسی وقت مصرعے کے حروف کے عدد نکالے گئے، جن سے ۱۳۵۷ کا عدد برآمد ہُوا۔ حفیظ صاحب نے اپنے بھائی سے کہا، دیکھیے دو سال بعد ۱۳۵۷ھ میں یہ مصرعہ کس کی تاریخ وفات کا مصرعہ بنتا ہے۔

اس واقعے کے دو سال بعد علامہ اقبال کا انتقال ہُوا۔ حفیظ صاحب اس بات کو بھول چکے تھے۔ اُن کے بھائی نے اُنھیں یاد دلایا کہ ـــــ

"صدق و اخلاص و صفا باقی نماند"

جس نے کہا، یہ مصرعہ خود اُس کی تاریخ وفات کا مصرعہ بن گیا۔

کلامِ اقبال

شیخ اعجاز احمد کو لڑکپن ہی سے علامہ اقبال کے کلام سے دلچسپی اور شغف رہا ہے ۔ ۱۹۱۱ء میں جب علامہ نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "شکوہ" حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تو شیخ صاحب سیالکوٹ سے علامہ کے والدِ بزرگوار کے ہمراہ لاہور گئے اور اس اجلاس میں علامہ کی زبان سے اُن کی نظم سُنی ۔ شیخ صاحب اُن دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی ۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے ایک کاپی میں مختلف رسالوں اور اخباروں سے علامہ کی نظمیں نقل کرنی شروع کیں ۔ ان کا یہ شوق ترقی کرتا گیا ۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو علامہ کا کلام جمع کرنے کے اُنھیں اور زیادہ مواقع میسر آئے ۔ شیخ صاحب نے لاہور میں علامہ کی بہت سی نظمیں خود اُن کے کاغذوں سے نقل کی ہیں ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال انار کلی والے بازار میں رہتے تھے ۔

شیخ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ـــــ

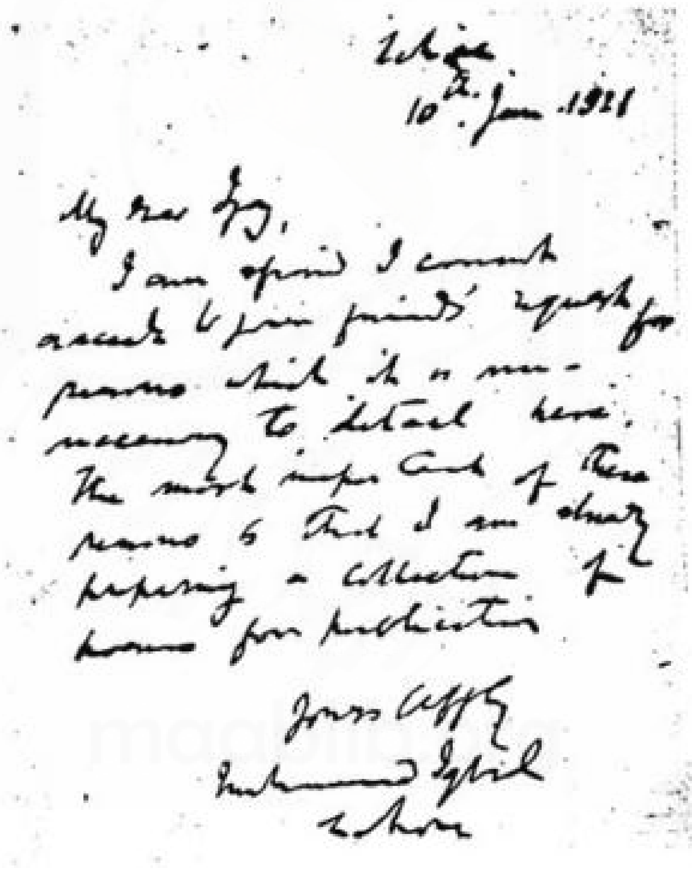
"میں خاصا بدخط ہوں۔ اس لیے میری خواہش تھی کہ چچاجان کا سارا کلام ایک خوبصورت بیاض میں خوشخط لکھوا کر رکھوں۔ اس خواہش کی تکمیل کا سامان ۱۹۱۹ء میں یوں ہوا کہ میرے ایک ہم وطن شاہ نواز صاحب نے جو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، میڈیکل کالج لاہور سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان دے کر سیالکوٹ میں مطب شروع کیا۔ میں بی۔ اے کا امتحان دے کر سیالکوٹ آیا تو اُن کے مطب میں چونکہ مریض ابھی زیادہ نہیں آتے تھے، لہٰذا شعر و شاعری کا چرچا رہتا۔ ڈاکٹر شاہ نواز صاحب بڑے خوشخط تھے۔ انھیں میری خواہش کا علم ہوا تو بڑے شوق اور بڑے اصرار سے کتابت کا کام اپنے ذمّے لیا۔ چنانچہ موجودہ بیاض بڑے اہتمام سے تیار کرائی گئی اور ڈاکٹر شاہ نواز صاحب نے میری کاپی سے چچاجان کا کلام بیاض میں نقل کرنا شروع کر دیا۔ کاپی میں تو یہ سب کلام بے ترتیب لکھا ہوا تھا۔ بیاض کے لیے طے پایا کہ پہلے اردو غزلیات، اُن کے بعد فارسی کلام، جو بہت زیادہ نہ تھا۔ اس کے بعد وہ کلام جو اکبر الٰہ آبادی مرحوم کے رنگ میں تھا اور سب سے آخر میں نظمیں درج کی جائیں۔ چنانچہ ہر روز میں اور

ڈاکٹر شاہ نواز بہت سا وقت اس کام میں صرف کرتے جب میں لاء کالج میں داخلہ لینے کے لیے لاہور جانے لگا اس وقت تک غزلیات، فارسی کلام اور اکبرؔ، اقبال کا بہت سا حصہ بیاض میں نقل ہو چکا تھا، لیکن ابھی بہت سا کلام باقی تھا جس کو شاہ نواز صاحب نقل نہ کر سکے۔ کیونکہ جب میں دوبارہ کالج کی چھٹیوں میں سیالکوٹ آیا تو ڈاکٹر صاحب کا کام چل نکلا تھا اور انھیں اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ اس کام کو جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ باقی کلام میں نے خود اپنے قلم سے اس بیاض میں منتقل کیا۔ لاء کالج کے زمانے میں بھی گاہے گاہے چچا جان کی میز پر سے ان کا تازہ کلام نقل کرنے کا موقع مل جاتا.....''

''سن ۱۹۲۱ء کے ابتدا کی بات ہے۔ میرے ایک دوست کے عزیز جو میرٹھ کے رہنے والے تھے، اُن کے پاس سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ اُن کا نام جہاں تک مجھے یاد ہے، مشتاق تھا۔ شعر سے دلچسپی رکھتے تھے اور اکثر ہماری مجالس میں شامل ہوتے تھے۔ انھوں نے بیاض دیکھی تو کہا کہ تمھارے چچا اپنے کلام کا مجموعہ شائع کیوں نہیں کرتے۔ بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے خط لکھوایا کہ انھیں

اگر اجازت دی جائے تو وہ اس مجموعے کو شائع کرنے پر
تیار ہیں۔ اس کے جواب میں چچاجان نے لکھا کہ وہ خود اپنی
نظموں کا ایک مجموعہ اشاعت کے لیے مرتب کر رہے ہیں،
لہٰذا وہ اپنی نظموں کی اشاعت کی اجازت نہیں دے سکتے۔
چنانچہ مشتاق صاحب کی خواہش دل کی دل ہی میں رہ گئی۔"

علامہ کا یہ خط انگریزی میں ہے۔ اس کا عکس ذیل میں دیا جا رہا ہے ——



Lahore
10th Jan. 1921

My dear Sir,
I am afraid I cannot accede to your friend's request for reasons which it is unnecessary to detail here. The most important of these reasons is that I am already preparing a collection of poems for publication.

Yours affly,
Muhammad Iqbal
Lahore

علامہ اقبال کے کلام کی نقل و اشاعت کا ذکر چھڑا ہے تو اس واقعے کا اظہار بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ علامہ جب اپنے پہلے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کی ترتیب و اشاعت کی تیاری میں مصروف تھے، تو ریاست حیدر آباد دکن کے نائب صدرِ محاسب (اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل) عبدالرزاق صاحب راشد نے جون ۱۹۲۴ء میں علامہ کے اردو کلام کا ایک مجموعہ رسالوں اخباروں اور کتابچوں سے نقل کر کے "کلیاتِ اقبال" کے نام سے علامہ کی اجازت کے بغیر شائع کر دیا۔ علامہ نے اس کا سختی سے نوٹس لیا، کیونکہ "بانگِ درا" بھی شائع ہونے والی تھی۔

علامہ کی وفات کے بعد اب تک تین مجموعے ان کے ایسے کلام کے شائع ہو چکے ہیں جو علامہ کے خود مرتب کردہ کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ ان میں سے "رختِ سفر" اور "باقیاتِ اقبال" ۱۹۵۲ء میں اور "سرودِ رفتہ" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ تینوں میں بہت سا کلام مشترک ہے۔ "سرودِ رفتہ" میں شائع ہونے والے اشعار کی تعداد اوّل الذکر دونوں مجموعوں سے بہت زیادہ ہے۔

اعجاز صاحب کا خیال تھا کہ ان کی بیاض میں اب تھوڑا ہی کلام ایسا ہوگا جو شائع نہ ہو چکا ہو۔ لیکن علامہ کے اپنے مرتب کردہ مجموعوں اور بعد میں شائع ہونے والے مجموعوں سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ ابھی کافی کلام ان کی بیاض میں ایسا ہے جو شائع نہیں ہوا۔ چنانچہ میری استدعا پر انھوں نے "روزگارِ فقیر" کی جلد دوم میں ان اشعار کو شائع کرنے کی اجازت دے دی جنھیں "کلامِ اقبال" کے ایک علیحدہ اور مستقل باب کی صورت میں شامل کیا جا رہا ہے۔

علامہ اقبال کے ان اشعار کے مطالعے سے ارباب ذوق اور سخن سنج حضرات اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ اقبال کی شاعری نے کس تدریج کے ساتھ ترقی کی ہے اور نومشقی سے پختہ گوئی اور قادر الکلامی تک وہ کن راہوں اور منزلوں سے گزر کر پہنچے ہیں اور ان کے کلام کو کب بلوغ نصیب ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری "جزویست از پیغمبری" کا مصداق بن گئی۔

اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں جتنے بھی نبی اور رسُول بھیجے، اُنھوں نے دُنیا سے کچھ نہیں سیکھا، بلکہ ہمیشہ دُنیا کو سکھایا۔ اسی لیے اُن کے ارشادات نومشقی اور ترقی و پختگی کے مراحل و مدارج کے وجُود سے آشنا نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ آغاز نبوّت ہی میں درجۂ کمال کو پہنچے ہُوئے تھے۔ اس کے برعکس دُنیا کے دُوسرے اہلِ فکر، ارباب ادب اور شعرا بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا اثر قبُول کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں مشق و مطالعے کے ساتھ ساتھ ترقی نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری پر بھی ترقی کے یہ تمام ادوار گزرے ہیں، جن کی نمایاں جھلک مندرجہ ذیل اشعار میں دکھائی دیتی ہے۔ ان اشعار سے اس کا بھی پتہ ملتا ہے کہ اقبال کا دل ہی نہیں شعُور بھی بیدار تھا۔ اپنے قلم سے نکلے ہُوئے ہر شعر کی اشاعت پر انھیں اصرار نہ تھا۔ علامہ نے خود اپنے ہی گلدستۂ افکار سے لالہ و گل اور شعلہ و شبنم کو چُن کر جدا کیا ہے۔

علم و ادب کی دُنیا میں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ مشاہیر کی وفات کے بعد اُن کے عقیدت مندوں نے اُن کے قلم سے نکلے ہُوئے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر

کو محفوظ کیا ہے۔ مثلاً غالب کے "نسخہ حمیدیہ" میں غالب کا وہ سب کلام جمع کر دیا گیا ہے، جسے غالب اور اُن کے اہلِ علم ہم نشینوں اور دوستوں نے انتخاب کے قابل نہ سمجھا تھا۔ اسی طرح لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی کے بدوِ شعور سے لے کر زندگی کے آخر دور تک کا تمام کلام متعدد جلدوں میں چھاپا گیا ہے۔ یہی نوعیت کلامِ اقبال کے اس باب کی ہے۔ اس کلام میں اُن کے نو مشقی کے زمانے کے ایسے اشعار بھی ملیں گے:-

وہ کہتے ہیں یُوں میری میت پہ آ کر
جو وحشت ہے تو پھاڑ دے اب کفن بھی

○

میری فُرقت میں تم مرو، توبہ!
یہ حسینوں کے حال ہوتے ہیں

○

مشاطہ باندھ کس کے حنا بند اس قدر
بولیں بگڑ کے "ولئے یہ اچھی حنا لگی!"

علامہ اقبال نے نواب مرزا داغ کے آگے جب زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ اُن کی غزل کا یہ مقطع غالباً اُسی زمانے کا ہے ــــ

تُجھ کو اقبال اُن سے کیا نسبت
دِلّی والے زبان والے ہیں!

مگر پھر مشق و مطالعے کی ترقی کے بعد وہ یوں فرماتے ہیں ــــ

نہ یہ دلّی کی اردو ہے نہ یہ پورب کی بولی ہے

زباں میری ہے اے اقبالؔ بولی دردمندوں کی

پھر فکر و نظر کی بلندی نے ان کی شعر گوئی کو اس اعلیٰ معیار تک پہنچا دیا ہے۔

گفتند فطرتِ گلِ خنداں نصیب تو

گفتم مزاجِ غنچۂ دل گیرم آرزوست!

سوزِ حیات باز بہ بخشی اگر مرا

چیزے کہ دیگر از تو نہ گیرم آرزوست!

○

رونقِ میخانہ باقی گردشِ صہبا سے ہے

گردشِ صہبا وصالِ ساغر و مینا سے ہے

○

گداگری ہے حقیقت میں وعدۂ احساں

کرم ستم ہے جو سائل کو انتظار رہے

طنز و مزاح میں یہ قطعہ کس قدر لطف انگیز ہے ———

ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر
ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل گوارا

خفیہ پولیس میں جب بے حد ہو گئی ہے تنخواہ[۱]
ہندو ہیں پیشہ ورافسر مسلم ہیں آنریری[۲]

۱؎ Paid
۲؎ Honorary

شیخ اعجاز احمد کی قیمتی بیاض میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ہر قسم کے اشعار غزلیں، نظمیں اور قطعے درج تھے، پوری دیدہ ریزی کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی کہ "روزگارِ فقیر" میں وہ اشعار لیے جائیں جو نہ علامہ کے مرتب کردہ مجموعوں اور نہ باقیاتِ اقبال کے موضوع کی کسی کتاب میں پائے گئے ہیں۔ گویا علامہ کے کلام کے تمام مجموعوں اور باقیات کے موضوع کی کم و بیش تمام کتابوں سے موازنہ کے بعد صرف وہی اشعار درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو یا تو بالکل ہی غیر معروف ہیں اور یا ایک آدھ بار اس زمانے میں کسی اخبار یا جریدے کی زینت بن کر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اگر اس موازنے میں کوئی کوتاہی نظر آئے تو اُسے محض سہو سمجھنا چاہیے۔

اپنے اشعار کا نذر پر نقل کرتے ہوئے خود شاعر سے بھی بعض اوقات بھول چوک ہو جاتی ہے۔ رسالوں اور اخباروں میں بھی کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ پھر نقل کرنے والے سے بھی سہو و تسامح کا امکان ہے، بہرحال شیخ صاحب کی بیاض میں جس طرح اشعار درج تھے، اُن کو اسی طرح نقل کیا گیا ہے۔

آخر میں راقم الحروف کو یہ عرض کرنا ہے کہ علامہ اقبال کے ان اشعار سے اُن کے کمالِ فن کا اندازہ لگانے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ جو مجموعے انھوں نے خود مرتب کیے ہیں، دراصل وہی ان کے کمالِ فن کا حقیقی مظہر ہیں۔

○

فارسی کلام

غزلیات

"پیامِ مشرق" میں چھ اشعار کی ایک غزل ہے، جس کا مطلع ہے ؎

بیار بادہ کہ گردوں بکامِ ما گردید
مثالِ غنچہ نوا ہا ز شاخسار دمید

اس غزل کے تین شعر جو "پیامِ مشرق" میں یا کہیں اور شائع نہیں ہوئے حسبِ ذیل ہیں ــــ

زخارِ راہ مترس اے جوان و ہمت خواہ
بمنزلے نہ رسید آنکہ زحمتے نہ کشید

مریدِ صوفیِ پیرم کہ ساغرِ لب ریز
بلب رساند بہ آنساں کہ قطرۂ نہ چکید

چناں ز نقشِ دوئی شُستہ لوحِ خاطرِ خویش
کہ وحشیِ توہم از آہوئے خیال رمید

○

غزل کے چار شعر جو کسی مجموعے میں نہیں پائے گئے۔

پیرہنِ وجودِ من چہ آتشِ جنوں گرفت
سینہ بہ برق در کنم دیدہ بہ نشتر زنم

من آں نیم کہ غش کنم برسرِ طُور چوں کلیم
برقِ تجلیِ ترا گیرم و بر جگر زنم

رندِ ھزار شیوہ ام سرخوش و ہوشیار ہم
بادہ بیک نفس کشم شیشۂ مے بہ سر زنم

○

غزل کے پانچ اشعار، جو کسی مجموعۂ کلام میں نظر نہیں آئے:

اے گُل ز خارِ آرزو آزاد چوں رسیدۂ
تو ہم ز خاکِ ایں چمن مانندِ ما دمیدۂ

اے شبنم از فضائے گُل آفریستم چہ دیدۂ
دامن ز سبزہ چیدۂ تا با فلک رسیدۂ

با من مگو کہ ہمچو گُل ہموارہ شاخ بستہ باش
مانندِ موجِ بُو مرا آوارہ آفریدۂ!

اُفتی اگر بدستِ ما حلقہ بہ گردِ تو کشم
ہنگامہ گرم کردۂ خود از میاں رمیدۂ

اقبالؔ عزتِ توام نشتر بدل ہمیں زند
تو در ہجومِ عالمے یک آشنا نہ دیدۂ

"پیام مشرق" میں چھ اشعار کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبّیرم آرزوست

اس غزل کے باقی چار شعر جو "پیام مشرق" میں نہیں، درج ذیل ہیں: —

گفتند فطرتِ گُلِ خنداں نصیبِ تو
گفتم مزاجِ غنچۂ دلگیرم آرزوست!

عذرِ گناہ کردم و دل در کنارِ من
آہے کشید و گفت کہ تعزیرم آرزوست

سوزِ حیات باز بہ بخشی اگر مرا
چیزے کہ دیگر از تو نمی گیرم آرزوست

تیغے برُوئے کافر و تیغے برُوئے خویش
در کارزارِ عشق دو شمشیرم آرزوست!

○

"پیامِ مشرق" میں پانچ اشعار کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

درجہانِ دلِ ما دورِ قمر پیدا نیست   انقلابیست و لے شام و سحر پیدا نیست

اس غزل کا چھٹا شعر جو "پیامِ مشرق" میں شائع نہیں ہُوا، حسبِ ذیل ہے —

عرب از زورِ عمل دست بہ شمشیر آمد
عجم از ضعفِ عمل گفت کہ شر پیدا نیست

○

"پیامِ مشرق" میں سات اشعار کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

شعلہ در آغوش دارد عشقِ بے پروائے من
بر نہ خیزد یک شرار از حکمتِ نازائے من

اس غزل کا عنوان پہلے "نذرِ ہندوستاں بہ دربارِ رسالت" تھا۔ اس کے دو شعر جو "پیامِ مشرق" میں نہیں ہیں، درج ذیل ہیں —

تا دمِ گرمم ز تابِ ایں چمن افزوں تر است
نغمۂ شوخم بخود می پیچد اندر نائے من

خاک را از جرعۂ باز آتشِ در گیر کن
ساقیِ من جامِ من مینائے من صہبائے من

○

"پیامِ مشرق" کی غزل جس کا مطلع ہے ؎
آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابانِ جنوں بُردی و رُسوا ساختی
کے پانچ اشعار جو "پیامِ مشرق" یا کسی اور مجموعے میں شائع نہیں ہوئے درج ذیل ہیں

اے خنک روزے کہ فرمانِ پریشانی دہی
مُشتِ خاکے را کہ حشرِ آرزو ہا ساختی

جُرمِ امروز است و خالِ چہرۂ فردائے حشر
آفتابِ ایں سحر از ظلمتِ ما ساختی

ایں چہ افسوں دیں چہ نیرنگ است اے حُسنِ غیور
دیدۂ بخشیدی، محرومِ تماشا ساختی

اے سرت گردم چہ پنداری کہ ما نشناختیم
چاک دامانِ خود از دستِ زلیخا ساختی

بر لبِ اقبال مُہرِ خامشی زیبا نہ بُود
چوں دلِ وارفتہ اش را نغمہ پیرا ساختی

منظومات

کتبۂ مزار

۳ ایسے اشعار جو علامہ کے کسی مجموعۂ کلام میں نظر نہیں آئے

گماں مدار کہ انجامِ سوختن خاک است
سرشتِ عشق ز آمیزشِ فنا پاک است
نگر کہ صیدِ محبت چہ صید گر آمد
عتابِ موت ہم از بستگانِ فتراک است
وداعِ غنچہ پیامے ز آفرینشِ گُل!
گُل است غنچہ کہ جیبِ حیاتِ او چاک است
وے نواز دم و رخت ازیں چمن بستم
کہ آشیانۂ بلبل بروں ز افلاک است!

پیغام

یہ دو شعر کسی مجموعۂ کلام میں شائع نہیں ہوئے —

با مرغِ حرم از منِ دل سوختہ فرما
اے آنکہ ز صحرا نفس آزاد بر آری
جویائے گلستانی و از طایرِ گمراہ
ترسم کہ سر از خانۂ صیاد بر آری

الور

یہ چار شعر کسی مجموعے میں نظر نہیں آئے —

گر فلک در الور اندازد ترا!
اے کہ می داری تمیزِ خوب و زشت
گوشت در صومعۂ برجستۂ
آنکہ بر قرطاسِ دل باید نوشت

آدمیت در زمینِ او مجو!
آسماں ایں دانہ در آنور نہ کشت
کشت اگر ز آب و ہوا خرستہ است
زانکہ خاکش را خرے آمد سرشت

نوائے بے نوا

(شبّیرؑ و جہاں آفرینی)

یہ پانچ اشعار روزنامہ "انقلاب" کے "شبّیر نمبر" کے لیے کہے گئے تھے، جو کسی مجموعے میں نظر نہیں آئے —

بیا تا ازیں انجمن بگذریم!
ازیں کاخ و کوئے کہن بگذریم
دگر خیمہ در کربلائے زنیم
بر ایں بے نوائی نوائے زنیم

نوائے کہ آتش کند خاک را
نوائے کہ واسوزد افلاک را

نوائے کہ بے سازِ تقدیر نیست
نوائے کہ بے ضربِ شبگیر نیست

اگر بندۂ ایں نوائے زند
چو یزداں جہاں آفرینی کند

عبد و حُر

یہ سات اشعار کسی مجموعہ کلام میں نظر نہیں آتے

حکمتے می گویمت روشن چو دُر
تا شناسی امتیازِ عبد و حُر

عبد گردد یاوہ در لیل و نہار
در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار

عبد از ایام می بافد کفن
روز و شب را می تند بر خویشتن!

مرد حُر خود را ز گل در می زند
خویش را بر روزگاراں می تند!

عبد چوں طائر بدامِ صبح و شام
لذّتِ پرواز بر جانش حرام!

سینۂ آزادۂ چابک نفس
طائرِ ایام را گردد قفس!

روز و شب بر دوشِ عبد آید سوار
حُر سوارِ ابلقِ لیل و نہار

زندگی

"پیام مشرق" میں اس عنوان کے تحت پانچ اشعار شائع ہوئے ہیں، جن کا پہلا شعر حسب ذیل ہے :-

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست ؟
گفتا مے کہ تلخ تر او نکو تر است !

چھٹا شعر حسب ذیل ہے ــــ

گفتم دریں زیاں کدہ عام است زندگی
گفتا بہلئے او ز دو عالم فزوں تر است!

دُعا

۱۹۲۸ء میں علامہ اقبال نے درد گردہ کے دوران چار دُعائیہ اشعار لکھے تھے، ان میں سے تین اشعار "سرود رفتہ" میں شائع ہو گئے ہیں جن میں کا پہلا شعر یہ ہے۔

دو سرا فرصت نہُوحق دو سہ روزے دگرے
کہ دریں دیر کہن بندہ و بیدار کجا ست !

چوتھا شعر جو "سرود رفتہ" میں شائع نہیں ہوا حسب ذیل ہے :-

اندریں عصر کہ "لا" گفت من "الا" گفتم
ایں چنیں بندۂ رہ بیں بہ شب تار کجاست!

گوئٹے

غالب کا ایک شعر ہے
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

اسی زمین میں علامہ نے انگریز شعرا براؤننگ اور بائرن۔ جرمن شاعر گوئٹے اور مولانا رومی کے متعلق ایک ایک شعر کہا تھا۔ براؤننگ بائرن اور مولانا رومی کے متعلق اشعار تو پیام مشرق میں شائع ہو چکے ہیں۔ گوئٹے والا شعر جو کہیں نظر نہیں آیا۔ ذیل میں درج ہے۔

تا آب و تاب بادہ شود دل فروز تر
آب از گہر بگیرم و در ساغر افگنم

قطعات

یہ قطعہ کسی مجموعۂ کلام میں نہیں پایا گیا۔

گفت با لیڈرِ ما حضرتِ شیطاں کہ خوشم
روز و شب در ہوسِ مرتبۂ جم باشی
گاست اندر طلبِ جاہ سبک باد کہ تو
رونقِ محفلِ اربابِ صفت کم باشی
صدرِ ہر محفلے و ناظمِ ہر انجمنے
خوش بود آنکہ پس از مرگ چناں ہم باشی
..... مزرعِ عقبےٰ ست تو ہم می دانی
قولِ من گوش کن ار وارثِ آدم باشی

"ہر گنا ہے کہ کُنی در شبِ آدینہ بکُن
کر تو از صدر نشینانِ جہنم باشی"

سنہ ۱۹۱۳ء

یہ قطعہ رسالہ "مرقع" جنوری ۱۹۲۶ء کے لیے کہا گیا تھا۔ علامہ کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آیا ——

گفتند دل آزاد کہ پر بستہ نکوتر
گفتم کہ ز بندِ دو جہاں رستہ نکوتر
گفتند ز خلوت کدۂ خویش بروں تا فت
گفتم شررِ جستہ ز نا جستہ نکوتر
گفتند کہ در بارۂ دو چیز دِگر گو
گفتم چو گُل از بادِ صبا خستہ نکوتر

یہ قطعہ رسالہ "نورجہاں" دسمبر ۱۹۲۵ء کے لیے کہا گیا۔

تابِ زن مثلِ گہر برخویشتن پیچیدہ بہ
چشمہ زارِ زندگانی از نظر پوشیدہ بہ

زندگی بحرِ پرآشوب است و زن پایابِ او
موج و گردابش نگر پایابِ او نادیدہ بہ

آشکارائی زنِ آفرینش دوری است
زانکہ حفظِ جوہرِ ہر خالق از مستوری است

متفرّقات

مندرجہ ذیل پانچ اشعار کسی مجموعے میں نہیں پائے گئے۔

چرخِ ستم پیشہ داد خاکِ مرا کش بہ باد
خیز کہ یک دجلہ آب از سرِ ایراں گزشت

مسلم کافر نما شد ز حرم گوشہ گیر
بر سرِ پیمانہ شد از سرِ پیماں گزشت

کشتیِ ایماں شکست، کفر بہ افسوں گری
دامنِ خود، ہمچو موج چید و ز طوفاں گزشت

بست تمنائے دید عہد چکیدن بہ اشک!
خوں شد و در دل بماند اشک ز داماں گزشت

خیز و شرابِ کہن باز بہ پیمانہ ریز
باز بہ پہلوئے ما طرحِ پری خانہ ریز

حسبِ ذیل اشعار کسی مجموعے میں نہیں پائے گئے:

مثالِ شمع زبانم ز آتشِ غم سوخت
نگاہ سوخت بچشم بسینہ ام دم سوخت
متاعِ ہستیِ من سوخت مغز جانم سوخت
دلم بسوخت تنم سوخت استخواں ہم سوخت

تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست!

"پیامِ مشرق" میں متفرق اشعار کے تحت دو شعر درج ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

منم کہ طوفِ حرم کردہ ام بُتے بہ کنار   منم کہ پیشِ بُتاں نعرہ ہائے ہُو زدہ ام

ان کے ساتھ دو شعر اور تھے، جو "پیامِ مشرق" یا کسی اور مجموعے میں شائع نہیں ہوئے، حسبِ ذیل ہیں —

زمانہ پیشِ نگاہم گزشت و می گزرد
چو سرو خیمۂ ہستی کنارِ جُو زدہ ام
دل تپیدہ کہ صُبحِ ازل مرا بخشید
زبر گرفتہ و بازش برُوئے اُو زدہ ام

○

تین اشعار جو کسی مجموعے میں نہیں پائے گئے:

"آب کہ از جُو گزشت باز نیاید بجُو"

شبنمِ بیدار دل گفت بہ گُل یک سحر

اے دلِ تو لخت لخت از ستمِ آرزو

برگِ تو از ہم شکست باز بہم آورش

رخت بہ منزل نبُرد آنکہ نیندوخت بو

غنچہ کہ حرفش شنید خندہ فرو خورد و گفت

"آب کہ از جُو گزشت باز نیاید بجُو"

○

حسبِ ذیل دو شعر بھی کسی مجموعۂ کلام میں نہیں ملے:

متاعِ قافلۂ ما حجازیاں بُردند

ولے تو لب نہ کشائی کہ یارِ ما عربی است

نہالِ ترک ز برقِ فرنگ بار آورد

ظہورِ مصطفوی را بہانہ بولہبی است

○

اردو کلام

غزلیات

شاعر مشرق علامہ اقبال کی جو معروف اور غیر معروف غزلیات یہاں پیش کی جارہی ہیں۔ ان میں سے بعض اُن کی شعر گوئی کے بالکل ابتدائی دور سے متعلق ہیں۔ ذیل میں سات اشعار کی ایک غزل پیش کی جارہی ہے۔ علامہ کے کسی مجموعۂ کلام یا باقیاتِ اقبال کے موضوع کی کسی کتاب میں یہ اشعار نظر نہیں آئے۔

غزل

میں تو کچھ اور ہو گیا جب سے
تیری محفل میں باریابی ہے

حسن مرتا ہے پردہ داری پہ
عشق کو شوقِ بے حجابی ہے

موت کے بعد دیکھیے، کیا ہو
زندگی میں تو سو خرابی ہے!
بادہ کش ہے نگاہ گلشن میں
پھول ساغر، کلی گلابی ہے!
آدمی کام کا نہیں رہتا
عشق میں یہ بڑی خرابی ہے
لن ترانی بھی، طور سوزی بھی
پردے پردے میں بے حجابی ہے
پوچھتے کیا ہو مذہب اقبال
یہ گنہگار بوترابی ہے!

○

غزل

اس غزل کا حرفِ مقطع "سرودِ رفتہ" میں اور ایک شعر "رختِ سفر" میں شائع ہوا ہے
باقی غزل حسبِ ذیل ہے۔

جو مضموں میرے دل سے حرفِ موزوں بن کے نکلے ہیں
وہی طائر بھی آخر گنبدِ مدفن کے نکلے ہیں!

مری جاں داستاں میری کلیجہ تھام کر سننا
کہ میرے حال پر آنسو مرے دشمن کے نکلے ہیں

مسافر منچلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے!
متاعِ دل کو لے کر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

رفوائے بخیہ گر! چاکِ محبت ہو، تو کیونکر ہو؟
مرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

پسند آئی نہ اُن کو سیرِ نخلستانِ ایمن کی
مگر صحرائے یثرب میں وہ کیا بن ٹھن کے نکلے ہیں

کبھی اس راہ سے شاید سواری تیری گزری ہے
کہ میرے دل میں نقشِ پا ترے توسن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ اے دستِ جنوں، بادِ محبت کی!
عرب میں جا کے پرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

گلستانِ جہاں میں مثلِ بلبل اُڑتے پھرتے ہیں
قلم سے شعر گویا میرے پریاں بن کے نکلے ہیں

سبب اے ہم نشینو! کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا
یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

نہ ترٹپایا کسی کو تیرے نظارے کے ارماں نے
کہ سارے دیکھنے والے تری چلمن کے نکلے ہیں

کیا حیراں فرشتوں کو بھی تیرے دردمندوں نے
خدا جانے تری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر ادھر کا رُخ نہیں کرتے
جو مثلِ بُو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

خدا جانے یہاں کی ہے ہوا وسعت فضا کیسی
تری درگاہ سے ذرّے بیاباں بن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشتِ زارِ دل کو میں نے اے فلک دیکھا
ستارے بھی ترے دانے مرے خرمن کے نکلے ہیں

جنھوں نے مثلِ شبنم اس چمن میں آپ کو دیکھا
وہی عاشق کسی کے چہرۂ روشن کے نکلے ہیں

تماشا کی جو وسعت میں نے اپنے دامنِ دل کی
ہزاروں دشت اک گوشے میں اس دامن کے نکلے ہیں

برہمن روزِ محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو
صنم جو تھے، وہ پتھر وادیِ ایمن کے نکلے ہیں

وہ مذبوحِ ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے
پُرانے آشنا میری رگِ گردن کے نکلے ہیں!

غزل

اس مشہور غزل کے گیارہ اشعار باقیات میں چھپ گئے ہیں۔ دو شعر یہ ہیں:

عجب شیوۂ عاشقی ہے جہاں میں
نہ معذور رکھنا، نہ معذور رہنا

مقدر کی تقسیم ہوتی تھی جس دم
پسند آ گیا دل کو مجبور رہنا

غزل

یہ مکمل ابتدائی غزل جو ۱۸ اشعار پر مشتمل ہے، کسی مجموعے میں نظر نہیں آئی۔

بر سرِ زینت جو شمعِ محفلِ جانانہ ہے!
شانہ اُس کی زلفِ پیچاں کا پرِ پروانہ ہے

شکوۂ جور و جفا سے باز آجاتے ہیں ہم
کیوں صفِ محشر میں حالت تیری بیتابانہ ہے

کچھ خبر پوچھیں اسیرِ زلفِ پیچاں کی، مگر
سو زبانیں اس کی ہیں کیا اعتبارِ شانہ ہے!

اللہ اللہ، دیدۂ واعظ میں آ اُڑ کر جا پڑی
پردہ دارِ مے کشاں خاکِ درِ میخانہ ہے!

میری باری پر گرا ہے دیکھ تو جذبِ شکست
ساقیا! توبہ سے پہلے ٹوٹتا پیمانہ ہے!

رنگ لائی ہیں عبادت کا مری مے خواریاں
رو کشِ سجدہ مری ہر لغزشِ مستانہ ہے

ہو گیا میری جبیں سے بُت پرستی کا ظہور
خطِ پیشانی رگِ سنگِ درِ میخانہ ہے

دیکھ، مغرب کی طرف سے جھومتا آتا ہے کیا
ساقیا! بادل نہیں، اُڑتا ہُوا میخانہ ہے

مے پرستی بھی نہاں ہے گردشِ تقدیر میں
خطِ پیشانی مرا، گویا خطِ پیمانہ ہے!

خانہ بربادی کے صدقے، سوئے صحرا جائیں کیوں
خیر سے گھر ہی ہمارا رشکِ صد ویرانہ ہے!

سخت جاں شرمندۂ شوقِ شہادت کیوں نہ ہوں
تیغ میں بل پڑ گیا، قاتل کو دردِ شانہ ہے!

ضعف کر دیتا مجھے شرمندۂ وحشتِ جنوں
خانہ بربادی مگر بولی یہیں ویرانہ ہے!

حضرتِ واعظ ہیں میخانے میں شاید آ گئے
کلمۂ "لاحول" وردِ ہر لبِ پیمانہ ہے!

حضرتِ ناصح کو اُس محفل میں لے جا کر کہا
ہاں بتا، اب میں ہُوں دیوانہ کہ تو دیوانہ ہے
تیری محفل میں کبھی چلتا، کبھی رُکتا ہے یہ
ذکر بھی میرا مگر میری طرح دیوانہ ہے!
اُس نے زانو بدلا تو تعظیم کو اُٹھنے لگا
تو بھی اے دردِ دلِ مضطر! کوئی دیوانہ ہے
شورشِ قَالُوا بَلٰی اُٹھی جہاں صُبحِ الَستْ
دل اُسی میخانے کا ٹوٹا ہُوا پیمانہ ہے
اُڑ کے لے اقبالؔ! سوئے بزمِ یثرب جائے گا
رُوح کا طائر عرب کی شمع کا پروانہ ہے

غزل

مندرجہ ذیل چار اشعار کسی مجموعے میں نظر نہیں آئے:

نظارۂ کہکشاں نے مجھ کو عجیب نکتہ یہ کل سمجھایا
ہزار گردش رہی فلک کو، مگر یہ تارے بہم رہے ہیں

کوئی غرورِ شہنشہی سے یہ جا کے میرا پیام کہہ دے
کہ اس زیاں خانے میں سکندر رہے نہ دارا نہ جم رہے ہیں

قفس میں اے ہم صفیر! اگلی شکایتوں کی حکایتیں کیا
خزاں کا دورہ ہے گلستاں میں نہ تو رہا ہے نہ ہم رہے ہیں

اگر تمنا ہو عافیت کی خدا سے بیگانگی نہ کرنا
جہاں میں تیرِ ستم سے ایمن طیورِ بامِ حرم رہے ہیں

○

غزل

"ذخیرۂ سفر" اور "سرودِ رفتہ" میں پانچ اشعار شائع ہوئے ہیں تین یہ ہیں:

دشمن شبِ فراق میں ہے اپنا آپ ہی
آجائے موت اپنی تو گنگا نہائیں ہم

ڈرتے تھے جس کے واسطے وہ بات اب کہاں؟
تو ایک اب کہے تو تجھے سو سنائیں ہم

اقبالؔ! شعر کے لیے فرصت ضرور ہے
اس فکرِ امتحاں میں غزل کیا سنائیں ہم

غزل

غزل کے یہ چار اشعار کسی مجموعے میں نظر نہیں آتے خیال غالب ہے کہ لندن میں کہے گئے۔

چمن ہے اپنا دلِ داغدار لالوں کا
بھلا ہو دونوں جہاں میں ستانے والوں کا

سنا ہے صورتِ سینا نجف میں بھی اے دل!
کوئی مقام ہے غش کھا کے گرنے والوں کا!

نہ پوچھ مجھ سے حقیقت دیارِ لندن کی
یہ اک جہان ہے گویا پری جمالوں کا

ولی بھی، رند بھی، شاعر بھی، کیا نہیں اقبالؔ!
حساب ہے کوئی کم بخت کے کمالوں کا!

غزل

اس غزل کے پانچ اشعار شائع ہو چکے ہیں۔ مندرجہ ذیل آٹھ اشعار کسی مجموعے میں نہیں ہیں:

تو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت
میں نہاں تجھ سے ترے موئے کمر کی صورت

خیر، کیا بات ہے پتھر ہے اگر دل تیرا
ہم بھی اس سنگ میں رہتے ہیں شرر کی صورت

کوچۂ عشق کے یہ راہنما بنتے ہیں
اللہ اللہ کوئی دیکھے تو خضر کی صورت

وصل کی رات تو آخر ہوئی اے دامنِ صبر
چاک ہو تو بھی گریبانِ سحر کی صورت

گر پڑا شیشۂ دل سنگِ درِ جاناں پر
یہ بھی ٹوٹے گا کہیں کاسۂ سر کی صورت

خون اب دل میں نہیں اے رہِ الفت باقی
ختم ہو تو بھی کہیں زادِ سفر کی صورت

کیوں نہ آنکھوں پہ بٹھاؤں تجھے اے وزنِ دُرّ
تو دکھاتا ہے کسی رشکِ قمر کی صورت

میں تو دیوانہ ہوا خیر کوئی بات نہ تھی
آپ کیوں پھر گئے لیکن مرے سر کی صورت

غزل

اس غزل کے پانچ اشعار "دستِ سفر" اور "سرشورِ رفتہ" میں شائع ہو گئے ہیں باقی اشعار یہ ہیں

کبھی نہ گوشِ سماعت سے شرمسار ہُوں میں
وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہُوں میں

نگاہ سے نہ کہیں صبح کو اُتر جاؤں!
شبِ وصال! کسی کے گلے کا ہار ہُوں میں

تمہاری شوخ نگاہی نے پڑھ کے کیا پھونکا
قرار بھی مجھے آئے تو بے قرار ہُوں میں

نسیمِ صبح نہ چھیڑے مجھے کہ دامن سے
کسی کے ہاتھ کا جھاڑا ہُوا غبار ہُوں میں

کسی طرح سے مری بام تک رسائی ہو
فغانِ خاک نشینانِ کُوئے یار ہُوں میں

غزل

دس اشعار کی اس ابتدائی غزل کے صرف دو اشعار "سرود رفتہ" میں پائے گئے

خارِ صحرا نہ سہی دشت کے پتھر ہی سہی
میرا اچھالا نہیں پھوٹا تو مقدر ہی سہی

روزِ محشر کوئی مے خوار نشے میں بولا
مئے احمر نہیں ملتی ہے تو کوثر ہی سہی

حشر کے روز مرا دستِ جنوں کہتا ہے
اب کہاں جائیں چلو دامنِ محشر ہی سہی

تیغِ ابرو جو نہیں ہے تو رگِ جاں کے لیے
مژۂ یار کا چبھتا ہوا نشتر ہی سہی!

لوگ کہتے ہیں کہ مشکل ہے عدم کی منزل
جیتے جی کاٹ تو لی کیا ہوا مر کر ہی سہی

کس کو یاد آؤں گا میں حشر کے ہنگامے میں
میرا دفتر ہے گناہوں کا تو دفتر ہی سہی!

اُن کو کافر جو کہیں ہم تو یہ ملتا ہے جواب
تم کو اسلام مبارک ہو، میں کافر ہی سہی

جب کہا آپ ستمگر ہیں تو فرماتے ہیں
آپ کہتے ہیں ستمگر تو ستمگر ہی سہی

غزل

سات اشعار کی یہ غزل بھی کسی مجموعے میں نہیں ملی۔

دل کو ذوقِ دید سے جس دم شناسائی ہوئی
آنکھ محشر کے نظارے کی تمنائی ہوئی

سر کے بل راہِ مدینہ میں جو میں چلنے لگا
شوق پر صدقے تمنائے جبیں سائی ہوئی

شوقِ گلزارِ مدینہ دل میں گھر کرنے لگا
خواہشِ جنت چھپی پھرتی ہے شرمائی ہوئی

چاک جب دستِ محبت نے کیا دامانِ "بیم"
حسنِ مخفی سے نگاہوں کو شناسائی ہوئی

میرے اندازِ تپیدن نے اُسے بہکا دیا
جاتی ہے موت اپنے آپ کو آئی ہوئی !

ہو گئی شرحِ رموزِ اتحادِ حسن و عشق
تیری یکتائی ہی آخر میری یکتائی ہوئی

لوگ بدنامِ محبت کہتے ہیں اقبال کو
غازۂ رخسارِ شہرت جس کی رسوائی ہوئی

غزل

اس غزل کے پانچ اشعار "سرودِ رفتہ" اور "رختِ سفر" میں شائع ہوئے ہیں باقی یہ ہیں:-

وہ کیا قدر جانیں گے میری وفا کی
کہ ہوتے ہیں جو آدمی جانتے ہیں!

بُری چال ہوتی ہے بے اعتنائی
یہی ہم تو اچھی بُری جانتے ہیں

کیا ماجرا اُن کے گھر کا تو بولے
قسم ہے تجھے ہم ولی جانتے ہیں

بڑے شوخ و گستاخ ہیں یہ زاہد
مُسلمان کو دوزخی جانتے ہیں

تری چال دیکھی تو بولی ہے جنبوں نے
قیامت کو اک دل لگی جانتے ہیں

میں ہوں صاف گو منہ نہ کھلوائیے گا
تمھاری وفا کو سبھی جانتے ہیں

گدا گر ہو اور بال ہوں سر کے لمبے
مسلمان اس کو ولی جانتے ہیں

بدلنا پڑا ہم نشیں! نامہ بر کو
اُسے واں کے سب آدمی جانتے ہیں

عجب زندگانی ہے اقبال اپنی
نہ مر جانتے ہیں نہ جی جانتے ہیں

کہا میں نے اقبال کو جانتے ہو
تو بولے یہ ہنس کر کہ جی جانتے ہیں

غزل

یہ ابتدائی غزل بھی کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی۔

ضد سے قمری نے کہا تم کو گلِ تر کا جواب
کہتی ہے بلبل نہیں سرو و صنوبر کا جواب

مجھ سے بگڑے تو بنے وہ اپنے تیور کا جواب
پھر کے مجھ سے بن گئے میرے مقدر کا جواب

اٹھ کے تربت سے ترا دامن پکڑ لیتے ہیں ہم
اور کیا دیں اے ستمگر تیری ٹھوکر کا جواب

سر چڑھا جاتا ہے میرے پھوٹ کر چھالا مرا
ہو سکا کب یہ میرے پھوٹے مقدر کا جواب

ساغرِ گیتی نما پر کر نہ اے جمشید! ناز
شیشۂ دل ہے ہمارا تیرے ساغر کا جواب

تا درِ میخانہ کیوں چلتا نہیں تو واعظا
آ دکھاؤں میں تجھے کیا نام کوثر کا جواب

ضد سے علّامے کو واعظ نے کیا غرقِ شراب
پر کہاں رندو! ہمارے دامنِ تر کا جواب

کان چمکے سے مؤذن کے لیے صبحِ وصال
واہ کیا سُوجھا مجھے اللہ اکبر کا جواب

مضطرب اے دل نہ ہو وہ دن تو آنے دے ابھی
ہم نے نالوں میں چھپا رکھا ہے محشر کا جواب

پڑ گیا چھالا زباں پر گرمیِ مے کے سبب
دیکھ لے زاہد! حباب جامِ کوثر کا جواب

اُس نے منہ موڑا جو میرے آبلوں سے کیا ہُوا
بن کے نشتر چبھ گیا چھالوں میں نشتر کا جواب

روز کہتے تھے کہیں مرتا نہیں، ہم مر گئے
دے دیا ہے آج آخر تیری مرمر کا جواب

میں نے یہ پوچھا کرو گے قتل تم کیونکر مجھے
مار کر تلوار بولے، ہے یہ کیونکر کا جواب

حشر میں نالے کرے گا کشتۂ رفتارِ یار
لطف تو جب ہے کہ ہو محشر میں محشر کا جواب

تیرے کانوں تک چلی جائے اگر میری خبر
پھر تو بن جائے ترے کانوں کے گوہر کا جواب

بن کے آیا ہے ہلالِ آسماں لیکن کہاں
تیرے ابرو، تیرے ناخن، تیرے خنجر کا جواب

ارشد و راحت سے ہیں اقبال میں خواہانِ داد
آبداری میں ہیں یہ اشعار گوہر کا جواب

غزل

غزل کے مندرجہ ذیل چار شعر کسی مجموعے میں نہیں پائے گئے

نظارہ ماہ کا سامانِ بے خودی ہے مجھے
یہ چاندنی ہے کہ گردوں سے مے برستی ہے

وہ سیرِ دل کی کرے ذوقِ جستجو ہو جسے
جہاں کو جس نے بسایا یہ اس کی بستی ہے

میں اُس دیار کے، پچھم کے ساکنو! صدقے
جہاں کے کوچوں میں غیرت بے تنگدستی ہے

ہزاروں نقش مٹے اک ترے بنانے کو
تری نمود سے غافل! نمودِ ہستی ہے!

غزل

یہ غزل کسی مجموعے میں نظر نہیں آئی۔

پر لگا کر جانبِ منزل اُڑا جاتا ہوں میں
سب سے آگے صورتِ بانگِ درا جاتا ہوں میں

واسطہ نیک و بدِ عالم سے جوں آئینہ کیا
سامنے آتا ہے جو کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں

آتشِ سامانِ ہستی تھا ترا نظارہ کیا
تجھ کو پایا ہے تو اب خود گم ہوا جاتا ہوں میں

قافلے والے بڑھے جاتے ہیں اے واماندگی
صورتِ نقشِ قدم پیچھے رہا جاتا ہوں میں

آہ دنیا جانتی ہے رعشۂ پیری اسے
داورِ محشر کی جانب کانپتا جاتا ہوں میں!

حشر میں مشکل تھا بے دیکھے ترا پہچاننا
ہو کے دُنیا ہی سے تیرا آشنا جاتا ہُوں میں

رہتا ہُوں اقبالؔ! گھر کی چار دیواری میں بند
کچھ سمجھ کر اہلِ عالم سے کھِچا جاتا ہُوں میں

غزل

اِس غزل کا صرف ایک شعر "رختِ سفر" میں نظر آیا ہے۔ باقی اشعار یہ ہیں:۔

جس کو شہرت بھی ترستی ہے وہ رُسوا اور ہے
ہوش بھی جس پر پھڑک جائیں وہ سودا اور ہے

بن کے پروانہ ترا آیا ہُوں میں اے شمعِ طُور
بات پھر وہ چھیڑ نہ جائے یہ تقاضا اور ہے

جان دیتا ہوں تڑپ کر کوچۂ الفت میں مَیں
دیکھ لو تم بھی کوئی دم کا تماشا اور ہے

اور کچھ اندھیر کر دینا نہ اے نورِ سحر!
ہجر کی شب ہے ابھی مجھ کو تڑپنا اور ہے

رنگِ اَوْ اَدْنٰی میں رنگیں ہو کے اے ذوقِ طلب
کوئی کہتا تھا کہ لُطفِ مَاخَلَقْنَا اور ہے

دیکھ اے ذوقِ تکلم یاں کوئی مُونسے نہیں
جو مری آنکھوں میں پھرتا ہے وہ نقشہ اور ہے

شمع کو بھی یُوں تو رُلواتی ہے پروانے کی موت
حسرتیں روئیں جسے وہ مرنے والا اور ہے

تم ہنسی میں سچ سمجھ بیٹھے نہیں حاشا نہیں
وصل کیسا؟ اب مرے دل کی تمنا اور ہے

قیس پر یوں طعنہ زن ہوتی ہے لیلیٰ دشت میں
جس کے کانٹے دل میں چبھتے ہیں وہ صحرا اور ہے

بدگمانی تم کو ہوتی ہے مری ہر بات پر

ٹھہرو ٹھہرو! سنبھلو سنبھلو! یہ فسانہ اور ہے

یوں نہ کھل کھیلو مری جاں ڈھب کی شوخی چاہیے

کوئی کیا سمجھے گا دیکھو اب زمانہ اور ہے

تیرے خنجر نے جگر ٹکڑے کیا اچھا کیا!

کچھ مرے پہلو میں لیکن چلبلا سا اور ہے

تاکتا پھرتا ہے جنسِ معصیت کو نقدِ عفو

تو نے کیا سمجھا ہے اے واعظ یہ سودا اور ہے

وہ صفِ محشر میں کہتے ہیں مجھے پہچان کر

تم وہی اقبال ہو، لو میں نے جانا اور ہے!

غزل

یہ نو اشعار کی غزل کسی مجموعے میں نظر نہیں آئی :-

بے حجابی بھی ہے تو ایسی ہے
جس میں پردے کی شان ہے گویا
ہے کشش پر مدار ہستی کا!
عشق جانِ جہان ہے گویا
جب سے دل میں ہوا گزر تیرا!
یہ مکاں، لامکان ہے گویا
کہتے ہیں دیکھ کر خموش مجھے
یہ بڑا کم زبان ہے گویا!
عذرِ نا سازیِ مزاج نہیں!
صبر کا امتحان ہے گویا

زندگانی کا اعتبار نہیں!
آدمی میہمان ہے گویا

تم مرے دل میں رہتے سہتے ہو
یہ تمہارا مکان ہے گویا

عشق کی راہ و رسم اُلٹی ہے
یاں خموشی زبان ہے گویا

اہلِ دل ہی اسے سمجھتے ہیں
شعر دل کی زبان ہے گویا

غزل

اس غزل کا ایک شعر نامکمل ہے۔ یہ بھی 'باقیات' کی کسی کتاب میں نظر نہیں آئی۔

حیرت نظر کو، دل کو تپش، لب کو خامشی
انعام بٹ رہے ہیں تیری جلوہ گاہ میں!

کیا آپ کو بھی یاد ہے اے حضرتِ کلیم!
ٹیلہ سا ایک ہے جو محبت کی راہ میں

ہنستا ہوں قصۂ "اَرِنی" گوئے طور پر
کیا جانے، کیا سمایا ہے میری نگاہ میں

غم سے مَیں اُن کے عشق میں گو خاک ہو گیا
پر شاد ہُوں کہ مل تو گیا گردِ راہ میں

(مصرعۂ اولیٰ موجود نہیں۔)
تعمیرِ بت کیے ہُوئے کعبے کی راہ میں

اقبالؔ کی نہ پُوچھ تلوّن مزاجیاں
میخانے میں کبھی ہے کبھی خانقاہ میں

غزل

یہ غزل بھی کسی مجموعے میں نہیں۔

کس شعلہ رُو کا دل میں میرے گزر ہُوا ہے
اِس سرزمیں کا یارب! ہر ذرّہ طُور کیوں ہے

کھاتا ہے تجھ کو اے دل کس کا غمِ جدائی!
تو بے قرار کیوں ہے تو ناصبُور کیوں ہے

ساقی وہ کونسا تھا، جس نے یہ مے پلا دی
صبحِ ازل کو پی تھی اب تک سرُور کیوں ہے

تیرے ہی دم قدم سے چمکا نصیب ورنہ
یہ خاک کیوں ہے وہ کوہِ طُور کیوں ہے

حبل الورید سے بھی نزدیک یوں رَسنا
او پاس رہنے والے آنکھوں سے دُور کیوں ہے

میں مشتِ خاک مجھ میں گوہر نہاں ہے کیسا
حیرت ہے مجھ کو یارب! ظلمت میں نور کیوں ہے

غزل

چار اشعار کی ایک اور غزل، جس کا تیسرا شعر نامکمل ہے:

سمجھ میں آ گئی تیرے پہیلی رازِ قدرت کی
مگر یہ بھی کبھی سوچا ہے تو خود بھی پہیلی ہے

نکل جائیں گے اے فنِ طلب ارماں ترے سارے
نمائش گاہِ ہست و بود میں ہر شے پہیلی ہے

... (مصرعۂ اولیٰ موجود نہیں) ...
یہ شعلوں میں پلی ہے بجلیوں کے ساتھ کھیلی ہے

میں اے اقبالؔ دِق آیا ہوں ان اُردو نویسوں سے
جو ہو اخبار روزانہ تو کہتے ہیں کہ "ڈیلی" ہے!

غزل

۱۶ اشعار پر مشتمل یہ بالکل ابتدائی غزل ۱۸۹۶ء کے کسی مشاعرے میں پڑھی گئی۔ اس کے ۱۳ اشعار شائع ہو چکے ہیں۔ باقی تین اشعار جو کہیں شائع نہیں ہوئے، درج ذیل ہیں:

جادو عجب نگاہِ خریدارِ دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے

چلتے ہوئے کسی کا جو آنچل سرک گیا!
بولی حیا حضور دوپٹہ سنبھال کے

حسرت نہیں، کسی کی تمنا نہیں ہوں میں
مجھ کو نکالیے گا ذرا دیکھ بھال کے

○

غزل

اس غزل کے مقطع میں حضرت داغؔ دہلوی سے تلمذ کی طرف اشارہ ہے۔ صرف ایک شعر اب تک شائع ہو سکا۔ باقی ۱۱ اشعار درج ذیل ہیں:-

برا ہوتا ہے عشقِ شعلہ رُویانِ ستمگر بھی!
یہ وہ آتش ہے جس میں خاک ہو جائے سمندر بھی

محبت میں دلِ مضطر جبھی کچھ لطف اُٹھاتا ہے
کہ ہو معشوق ظالم بھی، جفا جو بھی، ستمگر بھی

پتے کی کہہ رہا ہوں یاد ہو گی تجھ کو اے واعظ
وہ خلوت اور اس خلوت میں پھر آں "کار دیگر" بھی!

کہیں سر رکھ دیا تھا بے خودی میں پائے جاناں پر
وہیں جوڑے کے تاروں میں ہا قسمت کا اختر بھی

شکایت کو میں دوڑوں اور تم جانے نہ دو مجھ کو
مزا آئے جو ہو یہ ہاتھا پائی روزِ محشر بھی

بجا ہے شیخ جی سب کچھ مگر میں کس طرح مانوں
اجی حضرت! مرا دیکھا ہوا ہے آبِ کوثر بھی

سیہ ناموں کو دوزخ کے کسی کونے میں رکھ دیں گے
خدا سے چال کر جائیں گے عاصی روزِ محشر بھی

بوقتِ ذبح دم اس کا نکل کر آ گیا مجھ میں
تمھارے ہاتھ میں جاں بخش ہو جاتا ہے خنجر بھی

وہ ناکامِ تمنا ہوں اگر میں ڈوبنے جاؤں
تو اک پانی کے قطرے کے لیے ترسے سمندر بھی

مزا ہے گر جنوں میں بڑھ کے ناخن تیز ہو جائیں
ملیں بہرِ علاجِ جوشِ فرقت ہم کو نشتر بھی

جنابِ داغ کی اقبالؔ یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی، سخنور بھی!

غزل

پانچ اشعار کی یہ غزل اور کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی:

پاس ہے اور ڈھونڈتے ہیں اُسے
کتنے غافل جہان والے ہیں!

دب کے رہتے نہیں کسی سے بھی
جو زمانے میں آن والے ہیں!

میرے دل کے مکان میں رہیے
آپ تو لامکان والے ہیں!

کہہ رہے ہیں ملک یہ اہلِ زمیں
کتنی اونچی اُڑان والے ہیں!

تجھ کو اقبال! اُن سے کیا نسبت
دِلّی والے، زبان والے ہیں!

غزل

غزل کے مندرجہ ذیل اشعار کسی مجموعے میں نہیں پائے گئے:

کبھی جنسِ وفطرت ہے اہلِ ستم کی
کبھی ہم نے خنجر کو سیدھا نہ دیکھا

بہت تو نے اے آنکھ دیکھے تماشے
جسے دیکھنا دیکھنا تھا، نہ دیکھا

ظہور و عدم اپنا مثلِ شرر تھا
یہ سمجھو کہ دنیا کو دیکھا، نہ دیکھا

اگرچہ پھرا میں بہت اس چمن میں
کسی نے مرا آنا جانا نہ دیکھا

غزل

یہ ابتدائی غزل بھی کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اس کے دو شعر نامکمل ہیں:

اُٹھتے اُٹھتے وہ گئے بیٹھ مری محفل میں
کس طرح ٹل گئی' اللہ! ہماری آئی

زندگی موت سے ہم دوش ہُوئی جاتی ہے
میری میّت اُٹھی اور اُن کی سواری آئی

بُری عادت ہے یہ ہر روز بگڑ جانے کی
اب تلک آپ کو اے جان نہ یاری آئی

ہائے' کس ناز سے آیا ہے خیالِ جاناں!
چمنِ دل میں مرے بادِ بہاری آئی

وہ مجھے روتے ہُوئے دیکھ کے فرماتے ہیں
آپ کو بھی روشِ گریہ و زاری آئی!

ہائے، آکر وہ دمِ نزع کسی کا کہنا
ہائے اے کاش مجھے آئے تمھاری آئی

.... (مصرعۂ اولیٰ موجود نہیں) ....
تیر کو ڈھونڈتے ہاتھوں میں کٹاری آئی

.... (مصرعۂ اولیٰ موجود نہیں) ....
لاڈلی رندوں کی ساقی کی دلاری آئی

غزل

یہ ابتدائی غزل بھی کسی مجموعے میں نہیں پائی گئی :

یہ جوانی کے ولولے اے دل!
دو گھڑی کے اُبال ہوتے ہیں
میری فرقت میں تم مرو، توبہ!
یہ حسینوں کے حال ہوتے ہیں

زود! تم اپنی کم سِنی پہ نہ دو
سب حسیں خورد سال ہوتے ہیں

ہائے، وہ مار ڈھیلے ہاتھوں کی!
کس مزے کے ملال ہوتے ہیں

ذکر کچھ آپ کا بھی ہے اِن میں
قبر میں جو سوال ہوتے ہیں

اُف، یہ نازک مزاجیاں تیری
بات میں سَو ملال ہوتے ہیں

جن کی سیرت بھی دِل کو بھڑکا دے
وہ حسیں خال خال ہوتے ہیں

عاشقوں سے یہ پوچھتا ہے کوئی
کِس طرح پائمال ہوتے ہیں

شاعر اقبال سے نہ ہوں حیراں
آدمی باکمال ہوتے ہیں !

غزل

۲۱ اشعار کی یہ غزل رسالہ "خدنگِ نظر"، اگست ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ پندرہ اشعار ایک مجموعے میں شامل ہو چکے ہیں۔ باقی چھ اشعار درج ذیل ہیں:

دل کو ہے اندر ہی اندر جستجو تیری، مگر
کیا قیامت ہے کہ سمجھا تو نے بے پروا مجھے

جا تو نکلوں وادیِ ایمن میں میں بھی اے کلیم
لن ترانی کہہ نہ دے وہ شوخِ بے پروا مجھے

ہر کسی کو بزمِ ہستی میں ہے رونا موت کا
اور اس محفل میں رونا زندگانی کا مجھے

وہ گئے شہرِ خموشاں میں تو یہ آئی صدا
او گزرنے والے ٹھوکر سے مٹا جانا مجھے

لکھ دیا تھا میں نے کیا خط میں کہ آیا یہ جواب
کچھ سمجھ کر آپ نے یہ خط لکھا ہوتا مجھے

کس غضب کا رنگ لائی ہے سیہ کاری مری
مغفرت نے بھی نہ روزِ حشر پہچانا مجھے

غزل

اس غزل کے تین شعر شائع ہو گئے۔ باقی درج ذیل ہیں:

لاکھوں طرح کے لطف ہیں اس اضطراب میں
تھوڑی سی دیر اور رہو خط کے جواب میں

حسرت بھری نظر کو جو ساقی نے رد کیا
ڈوبی غریب شرم سے جا کے شراب میں

کیوں وصل کے سوال پہ چُپ لگ گئی تمھیں
دو چار گالیاں ہی سُنا دو جواب میں!

تابِ نظارۂ رُخِ روشن نہیں مجھے
جب بے نقاب تم ہو تو ہوں میں نقاب میں

غزل

انگلستان سے واپسی کے بعد کہی گئی یہ غزل کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی:

عیاں ستارے ہویدا فلک زمیں پیدا
تری خدائی تو پیدا ہے تو نہیں پیدا

عجیب جامۂ ہستی ملا ہے انساں کو
کہ جس کی جیب نہ دامن نہ آستیں پیدا

میں اشکبار ہُوا جب تو ہنس کے وہ بولے
ستارے ہونے لگے زیرِ آستیں پیدا

وہ چیز نام ہے جس کا تڑپ محبت کی
مرے وطن میں نہیں ہے ابھی کہیں پیدا

شبِ سیاہ میں تو ہے مہِ منیر میں تو
کہیں نہاں ہے ترا حسن اور کہیں پیدا

خدا جو دے مجھے قدرت تو کیا کروں پہلے
کروں صنم کدہ اک کعبے کے قریں پیدا

جو دیکھنا ہو تو چشمِ نیاز پیدا کر
ہر ایک ناز سے ہے ناز آفریں پیدا

چمن نہیں یہ سجودِ نیاز کا ہے محل
ہر ایک ذرے سے ہے مثلِ گل جبیں پیدا

نگاہ میں نہیں رہتا وہ نورِ بینائی
دلوں میں ہوتا ہے جس دم غبارِ کیں پیدا

حجاب آتا ہے کیا نازنیں کہوں اُس کو
کہ جس کی خاکِ قدم سے ہوں نازنیں پیدا!

صدا یہ دانۂ تسبیح سے نکلتی ہے
پھر اُس سے کوئی تو کرے اتنے ہم نشیں پیدا!

پھر آیا دیس میں اقبالؔ بعد مدت کے
پس از سہ سال ہوا گم شدہ نگیں پیدا!

کسی ادب کی جو قسمت بگڑتی ہے اقبالؔ
تو پہلے ہوتے ہیں نادان نکتہ چیں پیدا!

غزل

اس ابتدائی غزل کا ایک شعر نامکمل ہے:

میرے تپِ دروں کا بیاں قصہ خواں نہ ہو
شعلہ کی بھی زباں ہو تو ممکن بیاں نہ ہو!

پوشیدہ اس میں طرزِ جفائے بُتاں نہ ہو
اے دل شکایتِ ستمِ آسماں نہ ہو

مدِّ نظر جو دانۂ خالِ بتاں نہ ہو
یوں صبح اٹھ کے شیخ بھی تسبیح خواں نہ ہو

لیلیٰ کے ناقہ کو حرکت ساربان نہ ہو
جب تک کہ روحِ قیس بدن سے رواں نہ ہو

جنت وہ کیا کہ جس میں ترا آستاں نہ ہو
سر رکھنے کو ذرا سی جگہ بھی جہاں نہ ہو

جانا تو در کنار اگر قتل ہوں وہاں
تری گلی سے خون بھی میرا رواں نہ ہو

تنکا کوئی ہوا نے قفس میں گرا دیا
صیاد دیکھتا ہے خسِ آشیاں نہ ہو

کہتے ہیں آج غیر کی حسرت نکل گئی
اے دل نکل کے دیکھ کہیں میری جاں نہ ہو

اے دودِ آہ بس کہ نہیں تابِ جور اور
پیدا ہمارے سر پہ نیا آسماں نہ ہو

اے باغباں چمن کا ہر اک برگ ہے دو نیم
صحنِ چمن میں دفن کوئی نیم جاں نہ ہو

حوروں کے ناز مجھ سے اٹھائے نہ جائیں گے
مجھ ناتواں کا خلد میں یارب مکاں نہ ہو

.... (مصرعۂ اولیٰ موجود نہیں ہے۔) ....
جب آہ کا مزا ہے کہ پیدا دھواں نہ ہو

اقبال کہہ رہے ہیں یہ میری غزل کے شعر
بے سود ہے کلام اگر قدرداں نہ ہو

غزل

ابتدائی دور کی ایک اور غزل جو کسی مجموعے میں نہیں پائی گئی :

تیرے مریض کو تپِ فرقت ہے کیا لگی
اس کو دُعا لگی نہ کسی کی دوا لگی

کرتی ہے شمع اُس رُخِ روشن سے ہمسری
لو اِس زباں دراز کو بھی اب ہوا لگی

برباد کر رہی ہے جو یہ آشیاں مرا
صیاد تیرا ہاتھ بٹانے صبا لگی

زخمِ جگر جو تھے شبِ فرقت میں ہم سخن
چپکے سے چاندنی پسِ دیوار آ لگی

پھوٹا ہے سر مرا تو جنوں تیرا کیا گلہ
قسمت ہی اینٹ بن کے ہے ہاتھے پہ آ لگی!

تنگ آ کے اس کو بھی تری گالی سمجھ لیا
تیری خبر ہمیں جو نہ اسے بے وفا لگی

مشاطہ باندھ کس کے حنا بند اس قدر
بولیں بگڑ کے "واۓ" یہ اچھی حنا لگی!

خونِ رقیب نے اسے بے آبرو کیا
تیغِ نگاہِ یار سے مجھے کیوں نہ آ لگی!

زندہ کیا جو لب نے تو مارا نگاہ نے
یعنی بقا کے ساتھ ہے قیدِ فنا لگی

اقبالؔ گر یہی ہیں حسد کی بناوٹیں
جانے مشاعرے میں ہماری بلا لگی

○

غزل

"بانگِ درا" کی اس غزل کے باقی چار شعر درجِ ذیل ہیں :

خوف کچھ اس کا ترے فرقت نصیبوں کو نہیں
حشر اوروں کا ابھی فردا ہے اُن کا دوش ھے

کھل گیا آخر چمن میں ھستیِ بلبل کا راز !
لذّتِ پرواز ھنگامے سے ہم آغوش ھے

پوچھتی تھی گُل سے کل بلبل کہ اے جانِ چمن !
بھید یہ کیا ہے کہ میں نالاں ہوں تو خاموش ھے

بارِ ہستی میں وہ کیا لذت تھی ایسی اے حباب !
موج پشتِ غم سراپا تو سراپا دوش ھے

غزل

نو اشعار کی مکمل نظم جو کسی مجموعے میں شامل نہیں :

یہ جیتے ہیں تو مرتے ہیں، جو مرتے ہیں تو جیتے ہیں
نرالی زندگی ہوتی ہے کچھ اللہ کے بندوں کی

بھلا جنت میں واعظ دخل کیا سامانِ عشرت کو
وہ اک چھوٹی سی بستی ہے کسی کے دردمندوں کی

کسی کو قتل کرتے ہیں، کسی کی کھال اترتی ہے
یہ اُجرت ہے کتابِ عشق کے شیرازہ بندوں کی

ندامت حضرتِ واعظ کی ہوگی دید کے قابل
قیامت میں جو سن لی تو نے یارب اپنے بندوں کی

ملامت کر نہ ان کو پیت کی ریتیں نرالی ہیں
انوکھی سب سے ہوتی ہیں نمازیں دردمندوں کی

خدا جانے چھپی ہے کون سے شعلے کے دامن میں
سپند آسا صدائے رفتہ تیرے دردمندوں کی

خدا جانے مری آنکھوں نے اس ظلمت میں کیا دیکھا
کہ دل سے فکر رخصت ہوگئی دنیا کے دھندوں کی

پھنسے گا کیا وہ بلبل جو نہ نکلا آشیانے سے
نہیں ہے مجھ کو اے صیاد پروا تیرے پھندوں کی

نہ یہ دلّی کی اردو ہے نہ یہ پُورب کی بولی ہے
زباں میری ہے اے اقبالؔ بولی دردمندوں کی

غزل

غزل کے یہ آٹھ اشعار کسی مجموعے میں نظر نہیں آئے:

نہیں کچھ تذکرے دیدار کے مستوں میں اے واعظ
کسی کے ذکر کو سُن کر تڑپ جانے کی باتیں ہیں

مزے سے لے کے واعظ کیا بیاں کرتا ہے کوثر کا
یہ ذکرِ خلد ہے یارب یا میخانے کی باتیں ہیں!

مبارک ہو تجھے مستِ حیاتِ جاوداں رہنا
ہماری بزم میں اے خضرؔ! مرجانے کی باتیں ہیں

انا الحق کہہ کے بیتابانہ سولی پر لٹک جانا
نرالی تیرے دیوانے کی مستانے کی باتیں ہیں

تو رمزِ عجز کو غافل عبودیت سمجھ بیٹھا
ارے ناداں! یہ نادانوں کو سمجھانے کی باتیں ہیں

کسی پر جان دیتا ہے بھلا یوں بے غرض کوئی
یہ ساری اے ستمگر! دل کے آجانے کی باتیں ہیں

بیاں واعظ نے جس دم کی کہانی طور و موسیٰ کی
تو میں سمجھا کہ یہ بھی میرے ویرانے کی باتیں ہیں

شہیدِ جستجو ہے فکرِ انساں بزمِ ہستی میں!
یہ کس الجھی ہوئی گتھی کے سلجھانے کی باتیں ہیں

غزل

یہ غزل بھی کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے:

گزر کس صنم کا ہوا بُت کدے میں
کہ بُت بن گئے آج سب برہمن بھی

تصور کی اے دل یہ سب خوبیاں ہیں
کہ غربت میں کرتا ہے سیرِ وطن بھی

حسیں ہم نے دیکھے ہیں دُنیا میں لاکھوں
غضب ہے مگر آپ کا سادہ پن بھی

تصور کے کیونکر نہ قربان جاؤں
وصالِ وطن ہے فراقِ وطن بھی

مقدر میں بلبل کے تھا قید ہونا
تہِ دام تو تھی زمینِ چمن بھی!

بہار آئی وحشت کی ہے آمد آمد
گلے میرے ملنے لگا پیرہن بھی

مجھے نقدِ جاں اپنی بھاری ہے یارب
رہِ عشق میں ہے کوئی راہزن بھی

یہی ہے جو شوقِ ملاقاتِ حضرت
تو دیکھیں گے اک بار ملکِ دکن بھی!

غزل

غزل کے سات اشعار درج ذیل ہیں:

ٹوٹ کر آئینہ سکھلا گیا اسرارِ حیات!
آبرو چاہے تو کر سختیِ خارا پیدا

آگ سی قوم کے سینے میں بھڑک اُٹھتی ہے
ایک دل میں ہو اگر تازہ تمنّا پیدا!

عشق کو تنگیِ میدانِ عمل سے کیا خوف
کہ جنوں ذرّے سے کر لیتا ہے صحرا پیدا

سر پٹکتی ہے پہاڑوں میں ابھی تک بجلی
سنگ پھر کر نہ سکا شعلۂ سینا پیدا

جوئے بے مایہ نہ ہو ابرِ کرم سے نومید
کیا عجب تو بھی کرے شوکتِ دریا پیدا

تجھ میں باقی ہے اگر کچھ اثرِ سوزِ خلیل
نارِ امروز سے کر گلشنِ فردا پیدا

دل اگر خوں ہے تو ہے درد بھی سامانِ نشاط
گریۂ تلخ سے ہے خندۂ مینا پیدا!

غزل

یہ ابتدائی غزل غالباً گجرات کے مشاعرے کے لیے کہی گئی :

کام بلبل نے کیا ہے مانی و بہزاد کا
برگِ گل پر اُس نے فوٹو لے لیا صیاد کا

پہلے یہ بیگانگی ہم کو نظر آئی نہ تھی!
سبزۂ گلشن پہ سایہ پڑ گیا صیاد کا!

چلتے چلتے باغ میں بلبل نے یوں گل سے کہا
تجھ کو گلچیں کا مبارک مجھ کو گھر صیاد کا

کچھ کدورت ہے دِلوں کی کچھ دُھواں آہوں کا ہے
یہ زمین و آسماں ہے خانۂ صیاد کا

یادِ گلشن ہے زباں پر لب پہ ذکرِ آشیاں
داغِ ہجرِ گل جگر میں دل میں ڈر صیاد کا

بیکسوں کے پاس کون آئے قفس میں ہمصفیر
یادِ گُل آتی ہے یا آتا ہے ڈر صیاد کا!

ہائے کس کس لطف سے ظالم نے بلایا مجھے
بھول کر گلچیں سے پوچھا تھا پتہ صیاد کا

چلتے چلتے خارِ گل سے کیوں اٹک جاتا ہے یہ
دل کسی بلبل کا ہے دامن مگر صیاد کا

قتل کرتا ہے مجھے آتا نہیں ہے دل میں رحم
آہنِ مقراض کا ہے دل مگر صیاد کا

ہوں کبھی اِس شاخ پر میں اور کبھی اُس شاخ پر
ناک میں آخر کو دم آیا مرے صیاد کا

ہو گیا اقبالؔ قیدی محفلِ گجرات کا!
کام کیا اخلاق کرتے ہیں مگر صیاد کا

غزل

سات اشعار کی یہ غزل کہیں نظر نہیں آئی :

کھول دروازۂ خلوت گہِ ناز اے ساقی!
دیکھ تو مجمعِ اربابِ نیاز اے ساقی!

خطِ گلزار میں قرطاسِ زمیں پہ آخر
دستِ فطرت نے لکھا حکمِ جواز اے ساقی!

ایک ہی گردشِ ساغر میں کیا تو نے تمام
ورنہ قصّہ تھا محبت کا دراز اے ساقی!

عشقِ بے باک ہے مجبورِ نواہائے بلند
اس قدر پست نہ کر پردۂ ساز اے ساقی!

کیف یک گونہ حقیقت ہے زمانے میں فقط
مے و میخانہ و مینا ہے مجاز اے ساقی!

بند رہتی نہیں مستی میں زبانِ واعظ
اس تنک مے کو نہ کر محرمِ راز اے ساقی!
امتیازِ قدحِ شیخ و برہمن کب تک
صورتِ بادہ ہے پیمانہ گداز اے ساقی!

غزل

پانچ اشعار "بانگِ درا" میں اور دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

محفلِ ہستی میں آزارِ تہی دستی نہ ہو
یہ بھی اک میری جوانی کی تمناؤں میں تھی
فتنۂ محشر کسی صورت ہو بے تابِ نمود!
مشورت یہ آج تیرے ناشکیباؤں میں تھی

غزل

"بانگِ درا" میں شائع ہونے والی یہ غزل سات اشعار پر مشتمل تھی اور اُس کا پہلا مصرعہ یہ تھا:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں

"بانگِ درا" میں صرف چھ اشعار شائع ہوئے۔ ایک شعر حسبِ ذیل ہے:

ہے سلطنت جس کی دفن دلّی میں خود وہ کابُل میں سو رہا ہے
جہاں میں سب کچھ ہے اک علاجِ قضائے چرخِ کہن نہیں ہے

غزل

یہ ابتدائی غزل اگرچہ ایک مجموعے میں شائع ہو چکی ہے، جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

زکیں کے بیچ ان صورت کسی کی بھولی بھولی ہے

لیکن حسبِ ذیل ایک شعر کہیں شائع نہیں ہوا:

سُنا ہے آج جنّت میں بڑی رونق کا جلسہ ہے
ترے کُشتہ کا ہے نیلام اور حُوروں کی بولی ہے

نامکمل غزلیات کے متفرق اشعار

تری شکست ہی منظور تھی اُسے اے دل
بنا دیا تجھے نازک تر آبگینے سے
ہمیشہ وردِ زباں ہے علیؓ کا نام اقبال
کہ پیاس رُوح کی بجھتی ہے اس نگینے سے

○

حق میں آزادوں کے ہے قیدِ تعلق کیمیا
بن گئی گوہر جو موجِ آب زندانی ہُوئی

نقش ہے تقدیر تیرے خامۂ تدبیر کا
ہے بغل پروردۂ امروز ہر فردا ترا!
اک گھڑی میں شاخ سے پھوٹا، کھلا، مرجھا گیا
کیا یہی محبوب تھا اے بلبل شیدا ترا!

○

مرے نالے تو ایسے تھے کہ پتھر بھی پگھل جاتے
الٰہی تیری دنیا میں کوئی درد آشنا بھی ہے!
پسند آیا مجھے اے گل ترا اندازِ خاموشی
کہ تو اس باغ میں خاموش بھی خونیں نوا بھی ہے

○

کھلا راز اُن پہ مری بے بسی کا!
الٰہی بھرم کھل نہ جائے کسی کا!

سوا اس کے اب قوم کو کام کیا ہے
امیروں کا شکوہ، گلہ بے زری کا
خدا جانے کیا ہو گیا ہندیوں کو
کہ اس دیس میں راج ہے دشمنی کا!

○

حشر کو مانتا ہوں پر دیکھے
ہائے ہنگامہ اس کی محفل کا!
سدِّ رہ گرچہ تھی صعوبتِ راہ
لے اڑا اشتیاق منزل کا
تھی غضب طرزِ پرسشِ ہمدرد
لب پہ آیا ہے مدعا دل کا

○

قدسیوں کو رشک اس جمعیتِ خاطر پہ ہے
کچھ نہیں کھلتا کہ میں کس کے پریشانوں میں ہوں!
واعظوں کی بزم میں خاموش میں بیٹھا رہا
اپنا اپنوں میں ہوں بیگانہ میں بیگانوں میں ہوں!
جوں امامِ دانۂ تسبیحِ دنیا میں رہا
میں نہیں دانوں میں لیکن پھر بھی ان دانوں میں ہوں!
جاؤں دوزخ کو کہ جنت کو مجھے کیا حکم ہے
تیرے دیوانوں میں حیرانوں میں مستانوں میں ہوں!

○

پہلے مل جاتا تھا ریاضت سے ۔۔۔ اب کسی کو خدا نہیں ملتا
جستجو اپنی جستجو ہی نہ تھی ۔۔۔ ورنہ ڈھونڈیں تو کیا نہیں ملتا
ہم نے اقبال کو بہت ڈھونڈا ۔۔۔ کوئی اس نام کا نہیں ملتا

برائے مشاعرۂ بھوپال ۱۹۱۰ء

حلقۂ زنجیر کا ہر جوہرِ پنہاں نکلا
آئینۂ قیس کی تصویر کا زنداں نکلا!

ہم گراں جان کے لائے تھے عدم سے بلبل
باغِ ہستی میں متاعِ نفس ارزاں نکلا!

وسعت افزائیِ آشفتگیِ شوق نہ پوچھ
خاک کی مٹھی میں پوشیدہ بیاباں نکلا!

برائے مشاعرۂ بزمِ اردو، لاہور

بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور
جو اس چمن سرا میں بلند آشیاں رہے

موقوفِ آرزو ہے توانائیِ حیات

پیری شباب ہے جو تمنا جواں رہے!

کچھ اور شے نہیں ہے وہی زندگی ہے موت

جس زندگی میں کاوشِ سُود و زیاں رہے

○

دیکھ اے غافل یہ دنیا جائے آسائش نہیں

اس خطن سے کر گیا ہے آہوئے آرام رم

ہائے اپنا ہی نظر آیا نہ کچھ انجام اُسے

دیکھتا تھا جام میں ہر چیز کا انجام جم

دم میں جب تک دم ہے گردوں تک رسائی ہے محال

گلشنِ ہستی میں ہے سو دام کا اک دام دم

○

قطعات

قطرے کے منہ سے نام جو تیرا نکل گیا
بادل سے گر کے رُوئے ہوا پر سنبھل گیا
عظمت ہے خاص پاک مدینے کی خاک کو
خورشید بھی گیا تو وہاں سر کے بل گیا

○

صحنِ گلشن سے ہوں گو مَیں آشیاں برباد دُور
لالہ و گُل سے نہیں میرا دلِ ناشاد دُور
شبنمے را کز محیطِ بیکراں افتاد دُور
در کنارِ لالہ و آغوشِ گُل آرام نیست!

○

طنز و مزاح

آساں ہے اب تو ہندو و مسلم کا اتحاد
کعبے کو پھر شریف نے بتخانہ کر دیا

جوشِ جنوں میں آج سنا دی پتے کی بات
تو نے کمال اے دلِ دیوانہ کر دیا

کہتا تھا کوئی یونیورسٹی کے ہال میں
ڈگری دلا کے دین سے بے گانہ کر دیا

○

اقبالؔ نے مزاج جو پوچھا تو شیخ نے
موزوں کیا یہ شعر زبانِ سلیس میں
نیلام خرقہ چندۂ ٹرکی کے واسطے
عمامہ رہنِ مدرسہ بیٹوں کی فیس میں

○

اغراضِ مختلف کی ہے پیکار ہند میں
ہر قوم پائے بندِ رسوم و قیود ہے!
ممکن نہیں کہ صلح ہو انجن کے دور میں
نقصان یکہ بان کا گھوڑے کا سود ہے!

○

یوں مسئلہ زبان کا حضرت نے حل کیا
پوچھا جو میں نے کوئی طریقہ بتائیے

پنجابی گھر میں بولیے، اردو سٹیج پر
سینسز کے کاغذات میں ہندی لکھائیے
(مردم شماری)

○

ممکن نہیں کہ ایک ہی بازار میں چلیں
ہم سکے اور دھات کے وہ اور دھات کے
مخلوط انتخاب سے ہے نا امید ہند
پابندیاں کے ووٹ بھی ہیں چھوت چھات کے

○

ووٹوں پہ منحصر نہیں کونسل کی ممبری!
عہدہ ہے یہ جدید، جدید امتحان ہے
ہے شیخ کم زبان، برہمن زبان دراز
اس بات میں وہ جیتے گا جو کم زبان ہے

انساں نے سیکڑوں جم و دارا کیے پسند
کچلا اسے جنھوں نے عذابوں کے بوجھ سے
دریائے ہست و بود کی رفتار ہے وہی
دبتی ہے سطحِ آب حبابوں کے بوجھ سے

○

ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر
ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے سیری
خفیہ پولیس میں جب سے حد ہو گئی ہے قائم
ہندو ہیں ہیڈ[۱] افسر، مسلم ہیں آنریری[۲]

○

۱؎ Paid
۲؎ Honorary

بزمِ اردو لاہور کے ایک مشاعرے میں جو زیرِ صدارت نواب ذوالفقار علی خاں برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوا، علامہ اقبال اپنی نظم پڑھنے والے تھے۔ شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس وقت علامہ نے حسب ذیل شعر فی البدیہہ سنا کر لوگوں کو خاموش کر دیا ـــــ

شور ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے برات
آئیے، لاہور کے لوگوں کا جلسہ دیکھیے!

○

"بانگِ درا" میں ایک نظم "گلِ نے اور اونٹ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا دسواں شعر جو ترک کر دیا گیا اور "بانگِ درا" میں موجود نہیں حسب ذیل ہے ـــــ

جان بل (JOHN BULL) ہانکتا ہے ایک ہی لاٹھی سے ہمیں
یعنی ہے یک جہتی اس کی حکومت کا شعار

○

منظومات

نوعِ انساں کی محبت میں ہے مذہب کا کمال
امتیازِ کاسۂ شیخ و برہمن میں نہیں
خاک اگر ناپاک بھی چھونے سے ہو جائے تو کیا
پاک ہے جو چیز وہ آب و گلِ تن میں نہیں
ہند والے بھی کبھی رکھتے تھے جانِ دردمند
وائے حرماں، اب وہ طائر اِس نشیمن میں نہیں
یاد ہے تجھ کو کہ تو گُل در گریباں تھا کبھی
آج خاشاکِ چمن بھی تیرے دامن میں نہیں

وہ کرامت شیشۂ دل جس سے ہوجائے دراز
آج کل کے ساقیانِ سامری فن میں نہیں
رونقِ مے خانہ باقی گردشِ صہبا سے ہے
گردشِ صہبا وصالِ ساغر و مینا سے ہے

○

وید کے ایک اشلوک کا ترجمہ جو کسی مجموعے میں نہیں ملا۔

خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو
احباب سے کھٹکا ہو نہ اعداء سے حذر ہو
روشن مرے سینے میں محبت کا شرر ہو
دل خوف سے آزاد ہو بے باک نظر ہو!
پہلو میں مرے دل ہو مے آشامِ محبت
ہر شے ہو مرے واسطے پیغامِ محبت!

جولائی ۱۹۱۶ء میں ایک صاحب سعید اللہ نے اپنی آٹوگراف بک پیش کر کے درخواست کی کہ ڈاکٹر صاحب اپنے قلم سے اُس میں کچھ لکھ دیں۔ اس پر اُنھوں نے حسبِ ذیل شعر لکھ دیا ـــــ

دل ہے یک بین و یک اندیش تو پروا کیا ہے
بے خطر دیدۂ بیتاب کو ہر جائی کر!

○

۱۹۰۳ء میں ڈاکٹر صاحب نے ایک نظم "ایک دردمند دل کی عرض" کے عنوان سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلی کے مزارِ مقدس پر بھیجی تھی، جو وہاں عرس کے موقع پر پڑھی گئی۔ یہ نظم "برگِ گل" کے عنوان سے "مخزن" ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ "سرودِ رفتہ" میں یہ نظم شائع ہو گئی ہے، لیکن حسبِ ذیل سات اشعار اُس میں موجود نہیں ـــــ

(بندِ اوّل)

کس قدر سرسبز ہے صحرا محبت کا تری
اشک کی نہریں ہیں اور سائے ہیں نخلِ آہ کے

(بند دوم)

ہاں، قسم دیتا ہوں میں مدفونِ یثرب کی تجھے
کر دُعا حق سے کہ مَیں چُھٹ جاؤں اِس آزار سے

(بند سوم)

آہ اِس غم میں اگر تو نے خبر میری نہ لی!
غرق کر ڈالے گی آخر کو یہ چشمِ تر مجھے
آپ یہ وقفِ تپش ہم صورتِ سیماب ہے
کیا تسلّی دے بھلا میرا دلِ مضطر مجھے
کیا کہوں میں قصّۂ ہمدردیِ اہلِ وطن
تیر کوئی بھیجتا ہے اور کوئی نشتر مجھے
وُہ خوشی پھیلی مرے غم سے کہ شادی مرگ ہیں
زندگانی ہو گئی ہے موت سے بدتر مجھے!

ہمراں مُریدِ جسانداں خُفتۂ خاکِ نجف
موجِ دریا آپ لے جائے گی ساحل پہ مجھے

○

طلبائے علی گڑھ کالج کے نام

"بانگِ درا" میں یہ نظم سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اگرچہ شروع میں اس میں مندرجہ ذیل پانچ اشعار بھی شامل تھے:

مستیِ مے دُرونِ جام، پرتوِ مے بُرونِ جام
اِس کا مقام اور ہے، اُس کا مقام اور ہے

یُوں تو پلانے آتے ہیں محفل کو ساقیانِ ہند
لیکن انھیں خبر نہیں، یہ تشنہ کام اور ہے

جس بزم کی بساط ہو سرحدِ چیں سے مصر تک
ساقی ہے اس کا اور ہی، مے اور جام اور ہے

باقی ہے زندگی میں کیا ذوقِ نمو اگر نہ ہو

حرکتِ آدمی ہے اور حرکتِ جام اور ہے

فانوس کی طرح جیو، آتش بہ پیرہن رہو

اے جلنے والو! لذتِ سوزِ تمام اور ہے

○

پیام

ابتداء میں یہ نظم گیارہ اشعار پر مشتمل تھی اور اس کا عنوان تھا —— پیام راز (ایک خط کے جواب میں) —— اس نظم کے سات اشعار "بانگ درا" میں بہت سی ترمیمات کے ساتھ درج ہیں۔ باقی ۴ اشعار یہ ہیں:

کیونکر نہ وہ جہان کو پیغامِ بزمِ راز دے

غم کی صدائے دلنشیں جس کا شکستہ ساز دے

غافل! تجھے خبر نہیں لذت فراغ میں ہے کیا

دُنیا ادا پہ کر فدا، عقبےٰ بہانے ناز دے

کمتی جہان میں نہیں ارزاں متاعِ کافری
قیمت میں اُس کی خرقہ دے تسبیح دے نماز دے

ہو شوقِ سیرِ گل اگر، ایسا چمن تلاش کر
ہر غنچے کی چٹک جہاں لطفِ نوائے راز دے

ماہِ نو

"بانگِ درا" کی اِس نظم کے ۱۷ اشعار تھے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل ۱۰ اشعار کہیں شائع نہیں ہوئے ـــــ

شام نے آکر پڑھا دیباچۂ مضمونِ شب
ہے لبِ پیرِ فلک پر مصرعِ موزونِ شب
منشیِ قدرت مگر کھا کر کہیں ٹھوکر گرا
جب سیاہی گر چکی قطرہ سیاہی پر گرا!

کاسۂ سیمیں لیے ہاتھوں میں آیا، دیکھنا
آسماں دریوزۂ ظلمت کو نکلا دیکھنا

اے چراغِ دودمانِ آفتابِ خاوری
قہر ہے چشمِ تصور پر تری جادوگری

تو وہ راہرو ہے کہ پھرتا ہی رہا منزل کے گرد
قیس کی صورت جبیں سا ہی رہا محمل کے گرد

سرمۂ گوھر مری آنکھوں کو تیری دید ہے
اے مہِ نو تو ھلالِ مطلعِ امید ہے

آرزوئے نور میں ہے صورتِ سیماب تو
تیری بے آبی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو

چاہیے میری نگاہوں کو انوکھی چاندنی
لا کہیں سے ماہِ کامل بن کے ایسی چاندنی!

ظلمتِ بیگانگی میرے وطن سے دور ہو
خاکِ ہندستاں کا ہر ذرّہ سراپا طور ہو

"بانگِ درا" میں شائع شدہ نظم میں ایک شعر حسبِ ذیل ہے۔

چرخ نے بالی چُرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں اک مچھلی ہے سیمِ خام کی

ابتدا میں اس نظم کے حسبِ ذیل دو شعر تھے۔

چرخ نے بالی چُرالی ہے عروسِ شام کی
نعلِ زرّیں گر پڑی ہے توسنِ ایام کی
دام بافی کر رہی ہے زُلفِ مشکیں شام کی
نیل کے پانی میں اک مچھلی ہے سیمِ خام کی

مزدور کا خواب

یہ نظم بھی پہلی بار اس مجموعۂ اشعار میں شائع کی جا رہی ہے

مسافرات کے چاندی کی جیب و آستیں والے
ستارے آسماں کے جن کو کہتے ہیں زمیں والے
اُٹھا کر دوش پر اپنے عروسِ شب کی محمل کو
سحر کے خوف سے اُڑتے چلے جاتے تھے منزل کو
مثالِ گیسوئے شب خامشی بھی بڑھتی جاتی تھی
صدا موجوں کی لیکن ساحلِ دریا سے آتی تھی
وہ غافل سو رہا تھا بسترِ ریگِ بیاباں پر

ہوائیں چومتی آتی تھیں پہنائے سمندر کو
اُڑا سکتی نہ تھیں اس کے تنِ عریاں کی چادر کو

ہوئیں آنکھیں جو اعجازِ تخیل کی تماشائی
شبِ غربت میں کی صبحِ وطن نے جلوہ آرائی

کنارِ آبِ راوی خواب نے پہنچا دیا اُس کو
تماشا گاہِ طفلی کا سماں دِکھلا دیا اُس کو
ہُوا اک بار پھر داخل وہ اُس ٹوٹے ہُوئے گھر میں

جہاں محنت ہم آغوشِ کفایت ہو کے رہتی تھی
قناعت خانہ پرورِ محبت ہو کے رہتی تھی!
جہاں چرخے کی خواب آور صدا پردہ تھی آہوں کا

عاشقِ ہرجائی

"بانگِ درا" میں اس نظم کے صرف دو بند ہیں۔ اس کے پہلے بند میں حسبِ ذیل تین اشعار اور دوسرے بند میں یہ ایک شعر شامل نہیں :

پہلا بند

نازِ طوفانی ہے لیکن صورتِ گوشِ صدف
گوش تیرا موج کی شورش سے بے پروا بھی ہے

ہم عنانِ عصرِ حاضر عاشقِ عہدِ کہن!
دوش ہی گویا تجھے امروز بھی فردا بھی ہے

تو پریشاں مُو مثالِ قیس رہتا ہے مگر
اس پریشانی میں سیرِ گیسوئے لیلیٰ بھی ہے

دُوسرا بند

تو ذرا میری نظر کی جلوہ آشامی تو دیکھ!
طُور شرما جائے ایسا حوصلہ رکھتا ہُوں میں

آفتابِ صبح

آٹھ بند کی یہ نظم رسالہ "خدنگِ نظر" میں شائع ہوئی تھی۔ جن میں سے چھ بند ایک نیا بند اضافہ کر کے اس عنوان کے ساتھ "بانگِ درا" میں شائع کر دیے گئے۔ لیکن حسبِ ذیل دو بند ان میں شامل نہیں ہو سکے۔

اے چراغِ آسماں! اے آفتابِ صبح دم!
راستہ تیرا نہیں شرمندۂ نقشِ قدم!
ابر میں چھپنا ترا لاتا ہے دل پر ابرِ غم
یہ ادا چشمِ تماشائی پہ کرتی ہے ستم
تو وہ مطلع ہے سرِ دیوانِ عالم کے لیے
خامۂ قدرت نے آبِ زر سے لکھا ہے جسے

ہائے کس حسنِ جہاں آرا کی ہے تجھ میں جھلک
خیرہ ہو جاتی ہے تیرے نور سے چشمِ فلک

رُوح پرور ہے تجلّی تیری اے چشمِ فلک
ملتی جلتی ہے چراغِ طوٗر سے تیری چمک
خانۂ دل نور سے معمور ہو جائے مِرا!
نقطۂ دل تخمِ نخلِ طوٗر ہو جائے مِرا!

○

گُلِ پژمُردہ

ابتداء میں اس نظم کے سترہ اشعار تھے جن میں سے صرف چھ اشعار "بانگِ درا" میں ہیں۔ حسبِ ذیل گیارہ اشعار کسی مجموعے میں نظر نہیں آئے :—

ہم سفر آخر تری بُو کی، تری رنگت ہُوئی
ہائے کیا تاراج تیرے حُسن کی دولت ہُوئی
بلبلِ نالاں نہ پہچانے اگر دیکھے تجھے
ہو پشیماں عشق پہ اپنے جو پہچانے تجھے

سرگراں سی اب شعاعِ مہرِ تاباں تجھ سے ہے
آہ وہ بادِ سحر بھی اب گریزاں تجھ سے ہے
دیدۂ گلچیں کو اب تیری ادا بھاتی نہیں
لال جوڑا اب شفق بھی تجھ کو پہناتی نہیں
شاخ تیری بارِ بلبل سے نہ اب خم کھائے گی
آبِ گوہر سے نہ اب شبنم تجھے نہلائے گی
آہ وہ تیتلی وہ اک معصومیت اُڑتی ہوئی
تھک کے اب پرواز سے تجھ پر نہ بیٹھے گی کبھی
وہ ذرا سا جانور دل دادۂ آوارگی
کھینچتی تھی سُوئے گلشن جس کو شیرینی تری
گرچہ تھا صحنِ چمن میں عاشقِ شیدا ترا
اب تجھے دیکھے تو بھاگے الحذر کہتا ہُوا

میری آنکھوں کو مگر اے گُل بھلا لگتا ہے تو
آتی ہے مجھ کو تری پژمُردگی سے اپنی بُو
ہیں مرے سینے میں بھی پوشیدہ زخمِ بے رفو
داغ بن کر رہ اِسی اُجڑے ہوئے گلشن میں تُو
لب مرا ہے بلبلِ رنگیں نوا تیرے لیے
میری ٹھنڈی آہ ہے بادِ صبا تیرے لیے

○

موجِ دریا

اِس عنوان کے تحت دو بند کی ایک نظم "بانگِ درا" میں شائع ہوئی ہے۔ ابتدا میں اس نظم کے تین بند تھے۔ تیسرا بند حسبِ ذیل ہے:

غنچۂ آب میں گلشن کی تماشائی ہوں
اپنی ہستی کو مٹانے کی تمنائی ہوں

کشتۂ عشق ہوں، محرومِ شکیبائی ہوں
حوصلہ دیکھ، کہ میں صبر کی سودائی ہوں

زندگی جزو کی ہے کُل میں فنا ہو جانا!
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!

○

پھُول کا تحفہ عطا ہونے پر

آٹھ اشعار کی یہ نظم "بانگِ درا" میں ہے۔ ابتدا میں بارہ اشعار پر مشتمل تھی۔ باقی چار اشعار یہ ہیں ——

ہجومِ گل میں پسندِ نگاہِ ناز ہوا
ترانہ ریز تری زندگی کا ساز ہوا

کسی کے حسنِ دلآویز پر نثار ہے تو
خروشِ نغمۂ تارِ رگِ بہار ہے تو

یہ میرے ہاتھ میں خونی نوائیاں کیسی

مجھے خبر ہے جدائی میں بیقرار ہے تو

فسردگی کا تجھے میرے گھر میں کیا غم ہے

صبا ہے آہوں کی اور آنسوؤں کی شبنم ہے

○

کوششِ ناتمام

"بانگِ درا" کی یہ نظم چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں اس کا عنوان "..... کے نام" تھا۔ اس کے جو اشعار کسی مجموعے میں نہیں پائے گئے، حسبِ ذیل ہیں:—

آئی صدا یہ چاند کی بزمِ طواف پیشہ سے

صبحِ ازل سے ہے سفر رہتا قیام کے لیے

قلبِ زمیں سے مانگ کے لائی ہے داغِ جستجو

بادِ بہار لالۂ شعلہ بجام کے لیے

دُوسرا بند

قدرت کا اک فریب ہے لطفِ حصولِ مدعا
خارِ امید کی خلش رُوح کا تازیانہ ہے
مصروفیت طیور کی شوقِ فراغ سے نہیں
محنت کا ذوق باعثِ تعمیرِ آشیانہ ہے
خاکِ چمن نے کر دیا رازِ اُمید آشکار
کاوشِ دل ہے مدعا گُل کی کلی بہانہ ہے
قمری و عندلیب کو شرطِ حیات ہے وہ شور
گوشِ غلط شنو میں جو نالۂ عاشقانہ ہے

بزمِ انجم

"بانگِ درا" میں اس عنوان کے تحت تین بند کی ایک نظم شائع ہوئی ہے۔ پہلے اس نظم کا عنوان "تاروں کا گیت" تھا۔ دو بند کے بعد باقی اشعار غزل کے عنوان سے تھے، جس میں سے بہت سے اشعار ترک کر دیے گئے اور باقی اشعار تیسرے بند کی صورت میں شائع ہوئے۔ پہلے بند سے بھی ایک شعر حذف کیا گیا۔ حسبِ ذیل اشعار کسی مجموعے کی زینت نہیں بنے ——

پہلا بند

ہے خواب کی سیاہی چشمِ کشودہ جن کی
وہ نیلے آسماں کے اڑتے ہوئے شرارے

تیسرا بند

چھ اشعار کا یہ بند پہلے غزل کی صورت میں شائع ہوا تھا:

یہ رسم ہے پرانی، رہتے ہیں درد والے
بے خواب مثلِ انجم راتوں کی خامشی میں

سمجھیں گے کیا وہ ناداں آئینِ سروری کو
ناقص ہیں اب تلک جو آدابِ بندگی میں

ملّت حجاز کی ہے مصروفِ فرقہ بندی
نادان لُٹ رہے ہیں سُورج کی روشنی میں

بالائے ریگِ صحرا خوابیدہ رہ گئے یہ!
رخصت ہُوئے مسافر تاروں کی روشنی میں

بنتی بگڑتی دیکھیں ہم نے ہزاروں قومیں
اک بات ہے نرالی اِس بزمِ آخری میں

بارِ گلوئے ملّت طوقِ وطن نہیں ہے
تازے ہیں یہ مسافر اسلوبِ راہروی میں!

○

نانک

"بانگِ درا" کی اس نظم کے ابتداء میں گیارہ اشعار تھے۔ کسی مجموعے میں شامل نہ ہونے والے آخری تین اشعار درج ذیل ہیں ـــــ

تیرے پیمانے میں اے ساقی شرابِ ناب تھی
تیری شخصیت نے کھینچا ہر دلِ آگاہ کو

اپنے میدانوں میں جب رزمِ ممالک عام تھی
زندگی تیری سراپا صلح کا پیغام تھی

ہند کے بتخانے میں کعبے کا تو معمار تھا
کتنا باطل سوز تیرا شعلۂ گفتار تھا

○

ایک نظم کے دو بند جو کسی مجموعے میں نظر نہیں آئے۔

ترے غریبوں کو عُریاں تنی کا غم ہے وہی
وہی گلہ ہے امیروں کی کج ادائی کا!
وہی ہے گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر رونا
ترے نصیب کا، اپنی شکستہ پائی کا
اگرچہ تیز بہت نوکِ خار ہیں یاں بھی
نہیں دماغ میں سودا برہنہ پائی کا!
ہوئی خبر ترے حسن و جمال کی جب سے
رہا نہ شوق حسینوں کی آشنائی کا!
زمیں خراش ہوں میں ناخنِ خجالت سے
کہ حق ادا نہ ہُوا مجھ سے آشنائی کا

اگرچہ سب سے بُرا ہوں میں جانثاروں میں
مری جبیں پہ نہیں داغ بے وفائی کا
نجات سنگ ہے سرگشتگی ...... کی
گلہ نہ چاہیے گردوں کی کج ادائی کا
کھنچے ہے اپنی ہی گردن پہ بید کی تلوار
خدا دکھائے نہ آزارِ بے نوائی کا
مثالِ موج جہاں میں ہو خود شکن پہلے
گر جو قصد ہو تجھے بحر آشنائی کا
عصا بنے صفتِ گردباد آپ اپنا
شکستہ پا نہ کرے شکوہ بے عصائی کا
بہ لب ز دردِ تو آہے کہ داشتم دارم
..... سرِ راہے کہ داشتم دارم

وہ شعلے کاٹتے ہیں جو شرارے بوتے ہیں
شہنشہوں کو خیالِ مآلِ کار رہے

یہ آپ لائے ہیں مغرب سے سیلِ آزادی
بنائیں اب وہ عمارت کہ استوار رہے

گداگری ہے حقیقت میں وعدۂ احساں
کرم ستم ہے جو سائل کو اِنتظار رہے

طلسمِ خندۂ گُل میں ہے آشیاں اس کا
بہارِ باغ پہ پھر کس کو اعتبار رہے

اماں کبھی نہ ملی دستِ بُردِ دَوراں سے
ہمارے چھالے ہمیشہ پسندِ خار رہے

مگر فدا ہیں تری وسعتِ خیال پہ ہم
الٰہی! بزم تری زیبِ روزگار رہے

قیام کس کو ہے اس انقلاب خانے میں
کوئی بنا نہیں ایسی کہ پائیدار رہے
گرے ہوؤں کو اٹھانا کمالِ احساں ہے
وہ کام کر کہ زمانے میں یادگار رہے!
مٹے ہیں صفحۂ ہستی سے ہم، مگر باقی
ہماری عظمتِ دیرینہ کے مزار رہے
رہے تو ہم بھی، مگر کیا نمود تھی اپنی
نفس بہ جیبِ فنا صورتِ شرار رہے
شکستِ دل کی صدا کو بھی کان سنتے ہیں
کوئی جو محفلِ ہستی میں ہوشیار رہے

بے سلطنت قوم یا جسمِ بے روح

سات اشعار کی یہ سیاسی نظم کسی مجموعے میں نہیں پائی گئی :

ہے قوم جسم، سلطنت اُس میں ہے مثلِ روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

سعیِ شغال و گرگ سے جنبش ہوئی اگر
نافہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے

البتہ زندگانیِ شخصی کا ہے وجود
قانون میں ہر اک کے لیے زندہ باش ہے

پیمانہ ہائے ساختہ شاہِ وقت پر
محدود طالبین کی فکرِ معاش ہے

بے علمِ مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست
اُس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے

کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزوِ غیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دلخراش ہے
اپنی یہ احتیاط کہ بوسے پہ اکتفا
اس پر بھی یہ عتاب کہ تو بدمعاش ہے

پیش کش بہ ...

یہ نظم بھی علامہ کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آئی:

نغمۂ رنگیں سمجھ یا نالۂ پیہم سمجھ!
اس نوا کو یا نوائے ربطِ عالم سمجھ
پیش کش ہے دردمندوں کی یہی دو چار اشک
خواہ موتی، خواہ صبحِ عشق کی شبنم سمجھ
درد کے پانی سے ہے سرسبزیٔ کشتِ سخن
فطرتِ شاعر کے آئینے میں جوہر غم سمجھ

دل کو لیکن مانعِ خدمت نہیں افسردگی
اس نگیں کو تا ابد زندانیِ حسرت سمجھ

ہے ترے دم سے شرر آباد خاکستر مری
واسطے تیرے طبیعت ہے چمن پرور مری

گلستاں بن کر مہک اٹھا دلِ پرخوں مرا
ہے سرود آموزِ بلبل نالۂ موزوں مرا!

گردشِ پیہم مبارک ساغرِ خورشید کو
ہو گیا پابندِ مینا بادۂ گلگوں مرا!

زخمۂ اُلفت سے ہے تارِ رگِ جاں نغمہ خیز
یعنی تیرے سحر سے پیدا ہُوا افسوں مرا

میرے نظارے میں پیدا ہو گیا اندازِ نو
اور ہی میری زمیں ہے اور ہی گردوں مرا

ہے تری منت طلب میری بہارِ شاعری
تازہ تر ہے میرے دامن میں گُلِ مضموں مرا

عشق لیکن دردِ محرومی سے پاتا ہے کمال
ہجرِ لیلےٰ سے ہُوا آوارہ تر مجنوں مرا

ہے ترے نورِ خفی سے محفل افروزی مری
تیرے قدموں پہ تصدق ہے جگر سوزی مری

منظومات کے متفرق اشعار

طائرِ شام

لبریز ہے سرود سے تیرے سکوتِ شام
طائر کہاں ہے ایک طلسمِ نوا ہے تو
انساں کی ہے جو شام وہ تاروں کی ہے سحر
خوابیدہ ہیں نجوم اذاں کی صدا ہے تو

شمع

اس عنوان سے جو نظم "بانگِ درا" میں شائع ہوئی، اُس کے اشعار ابتدا میں چالیس تھے۔ جن میں سے ۲۹ "بانگِ درا" میں شائع کر دیے گئے۔ دس اشعار "سرودِ رفتہ" میں شائع ہو گئے ہیں۔ آخری بند کا ایک شعر، جو کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوا، حسبِ ذیل ہے :—

ورد اک وہمِ غیر میں ہوں میں پھنسا ہوا
آذر خلیل ہے بُتِ پندار کا ہوا

شکریہ

اس عنوان سے "سرودِ رفتہ" میں جو نظم شائع ہوئی ہے، اس میں دوسرے بند کا ایک شعر جو اصل نظم میں تھا، شائع نہیں ہوا —

جس کے بلبل عندلیبِ عقلِ کُل کے ہم صفیر
جس کے غنچوں کے لیے رخسارِ حُور آئینہ دار

میں اور تو

۱۹۱۸ء میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ نواب صاحب کرنال کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا، اس موقع پر پڑھی جانے والی علامہ کی نظم کے صرف نو اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہوئے ہیں۔ باقی تین اشعار حسبِ ذیل ہیں :—

مجھے آشیاں بتراز قفس، مری آنکھ میں گل و لالہ خس
تنِ ناتواں میں گرہ نفس کہ نہیں مجالِ نواگری

جو ترے غرورِ بلند پر ہے نوا کا تو بھی اثر
ترے ہر بیاں سے عزیز تر ہے مجھے پلاس[1] ابوذریؓ

ترا نالہ مرغِ شکستہ پر، نہیں زندگی کا پیام اگر
ترا سوز داغِ دلِ سحر، ترا ساز ننگِ نواگری

---

[1] چادر

○

○

مندرجہ ذیل پانچ اشعار جن میں سے پہلا شعر نامکمل ہے، کسی مجموعے میں نہیں ہیں:

جوشِ نمود سے ہُوا حسنِ بہار بے حجاب
...... (مصرعہ نہیں ہے) ......

اُترے چمن سے باغ میں کلیوں کے بھیس میں نجوم
کرتی ہے سیرِ بوستاں بن کے نسیم ماہتاب!

فیضِ سحاب سے ہُوئی جوئے چمن ترانہ ریز
ڈوبی ہُوئی ہے آب میں آتشِ سینۂ رباب

جام بکف ہے گُل اگر غنچہ سبُو بدوش ہے
ابرِ بہار بن گیا میکدۂ شرابِ ناب!

واہمہ ہوا کو ہے نقش گری میں کیا کمال
موجِ شکستہ سے کیا سازِ عمارتِ حباب

مذہب

یہ تین اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہوئے ہیں۔ ابتدا میں یہ نظم صائبؔ کے ایک شعر کی تضمین تھی، جس میں صائبؔ کے شعر کے علاوہ پانچ اشعار تھے۔ علامہ کے دو شعر اور صائبؔ کا تضمین شدہ شعر حسبِ ذیل ہے:

کانپتا ہوں پڑھ کے میں افسانہ اسرائیل کا
ڈر ہے غفلت سے نہ ہو تیرا مقدر بھی وہی

تیری دنیا قوتِ مذہب سے باقی ہے بکام
دین کے معیار سے موزوں ہے شعرِ زندگی

"سرو با یک مصرع از قیدِ خزاں آزاد شد
زندۂ جاوید می گردی اگر موزوں شوی"

۲ جولائی ۱۹۱۵ء

تنہائی

پانچ اشعار پر مشتمل "بانگِ درا" کی اس نظم کے مزید دو شعر:

آوارہ یہ چاند، رات خاموش
صہبائے نظارہ دے مۓ گوش

یہ بوئے گلِ قمر، یہ مہتاب
خمِ خانۂ دہر کی مۓ ناب

○

عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں!

"بانگِ درا" کی اس نظم میں یہ شعر شامل نہیں ہے:—

سرودِ مرغِ نوا ریز و ہم نشینیٔ گل
مرے نصیب کہاں غنچۂ مزار ہوں میں!

رات اور شاعر

یہ نظم "بانگِ درا" میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے دُوسرے بند میں حسبِ ذیل شعر نظر نہیں آتا:

یہ دلِ مُردہ کو تعلیمِ رضا دیتے ہیں!
لُٹ کے غارت گرِ گلشن کو دُعا دیتے ہیں

○

دُعا

"یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے"

علامہ کی یہ مشہور نظم "بانگِ درا" میں موجود ہے۔ اس کا یہ ایک شعر شائع نہیں ہوا:

آتشِ عشق جس کی کانٹوں کو جلا ڈالے
اس بادیہ پیما کو وہ آبلۂ پا دے

○

والدۂ مرحومہ کی یاد میں

اس نظم کے گیارہ اشعار "بانگِ درا" کے بعد منظرِ عام پر لائے جا چکے ہیں لیکن حسبِ ذیل ایک شعر کسی مجموعے کی زینت نہیں بن سکا :۔

وائے ناکامی کہ میں بھی آشنا حکمت سے ہوں
دُور ہوں، یخ پیرہن عقلِ خنک فطرت سے ہوں

○

خضرِ راہ

"بانگِ درا" کی اس نظم کے پانچویں بند کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے :

سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری — آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ المُلوک

جوابِ خضر کے اس بند کا مندرجہ ذیل چوتھا شعر "بانگِ درا" میں نہیں چھپا :۔

نوعِ انساں کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے یہ
شاہراہِ فطرت اللہ میں یہ بے عشارگری؟

○

سیرِ فلک

اس عنوان سے "بانگِ درا" میں ایک نظم شامل ہے۔ اس کے دوسرے بند سے جو دو شعر ترک کر دیے گئے اور باقیات کے کسی مجموعے میں شامل نہیں، یہاں درج کیے جاتے ہیں:

ظلمت افزا تھا اس قدر وہ مقام
چاند چمکے وہاں تو ہو بے ہوش
خنک ایسا کہ جس کے سامنے گرم
کُرۂ زمہریر کی آغوش!

○

جلوۂ حُسن

پانچ اشعار پر مشتمل "بانگِ درا" کی اس نظم کے مزید دو شعر:

یعنی جو آگ تارِ کو لگا دیتا ہے
اور دل کو شرر آباد بنا دیتا ہے

دورِ عصر کی ہستی کو مٹاتا ہے خیال!

ہر گھڑی ایک نیا دہر بناتا ہے خیال!

بچّوں کے لیے نظمیں

ابتدائی دور میں علامہ اقبال نے کچھ نظمیں بچّوں کے لیے کہی تھیں، جو نصاب کی کتابوں میں بھی شامل کی گئیں۔ ان میں سے بعض نظموں کے کچھ اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہوئے ہیں۔ باقی نظمیں کسی مجموعے میں نہیں پائی گئیں ــــ یہ نظمیں اور اشعار ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں ــــ

خدا کے حضور میں دُعاء

"لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری!"

"بانگِ درا" میں اس نظم کے مندرجہ ذیل ۴ شعر شامل نہیں:۔

میری خوشبو سے مُعطّر ہو زمانہ سارا

بن کے بلبل ہو مرے حُسن پہ دُنیا شیدا

علم دُنیا کے چمن میں ہو اگر گُل کی طرح
میں چہکتا رہوں اُس پھول پہ بلبل کی طرح
دُکھ اٹھائے مرے ہاتھوں سے نہ جاندار کوئی
اے خدا! عمر اسی طرح بسر ہو میری
دکھ بھی آجائے تو ہو دل نہ پریشاں میرا
شُکر ہر حال میں ہو میری زباں پہ تیرا

ایک پہاڑ اور گلہری

یہ نظم، جو انگریزی سے ماخوذ ہے، ۲۴ اشعار پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ۱۲ اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہوئے۔ باقی ۱۲ اشعار حسب ذیل ہیں:—

پہاڑ

ذرا سے قد پہ تجھے چاہیے نہ اِترانا
کہ میرے سامنے تیرا گھمنڈ ہے بے جا

مرے طفیل سے پانی ملا ہے دریا کو

دبائے بیٹھا ہوں دامن میں دشت و صحرا کو:

فلک کی شان سے آنکھیں ملائے بیٹھا ہوں

بنوں کو پیٹھ پہ اپنی اُٹھائے بیٹھا ہوں!

اسے جو چُومتی ہیں اُٹھ کے چوٹیاں میری

بلائیں لیتا ہے جُھک جُھک کے آسماں میری

جو برف ہے مرے سر پہ بدن پہ سبزی ہے

ہری قمیص پہ گویا سفید پگڑی ہے

بڑا پہاڑ ہوں میں شان ہے بڑی میری!

کسی سے ہو نہیں سکتی برابری میری

○

گلہری

ذرا سی بات ہے انصاف سے مگر کہنا
یہ زندگی ہے کوئی اس طرح پڑے رہنا
قدم نہ اُٹھے تو جینا ہے موت سے بدتر
ہزار عیب سے یہ ایک عیب ہے بڑھ کر
قلم بنا کے نہ لاتا اگر بری دُم کا
ہنر کو اپنے مصوّر بھلا دکھا سکتا؟
جہاں کے باغ کی گویا سنگھار ہے ہر چیز
کہ اپنی اپنی جگہ شان دار ہے ہر چیز
نہیں کسی کو حقارت سے دیکھنا اچھا!
یہ بات جس نے سمجھ لی وُہی رہا اچھا!

پہاڑ سُن کے گلہری کی بات شرمایا
مثل ہے وہ کہ بڑے بول کا ہے سر نیچا!

ایک گائے اور بکری

یہ نظم ۳۱ اشعار پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ۲۹ اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہو گئے۔ جو بارہ اشعار شائع نہیں ہوئے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

"بانگِ درا" میں پہلے دو شعر یہ ہیں:

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں!

کیا سماں اُس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں

ان اشعار کے بعد مندرجہ ذیل دو شعر جو ابتدائی نظم میں شامل تھے، "بانگِ درا" میں شائع نہیں ہوئے:

جن کے پانی میں وہ صفائی تھی
نظر آتے تھے تہ کے کنکر بھی!

کیا کہوں میں اُگا تھا کیا سبزہ!
کوئی مخمل کا فرش تھا سبزہ!

"گانے" کے شکایتی اشعار میں سے حسبِ ذیل اشعار "بانگِ درا" میں موجود نہیں:

بس چلے تو کہیں نکل جاؤں
دُودھ مکھن سے اس کو ترساؤں
ہم بھی آخر خدا کے ہیں بندے
روز کے ناز اُٹھ نہیں سکتے!
یہ غلامی ہمیں نہیں بھاتی
مَیں تو اس قید سے ہُوں گھبراتی
یُوں ہمیں قید میں جو رکھتا ہے
ہم نے کیا جانے کیا بگاڑا ہے

اپنا غصہ کبھی نکالوں گی!

دُم کی چابک سے مار ڈالوں گی

مجھ سے کرتا ہے یہ مُوا اَن بَن

توڑ ڈالوں گی دودھ کے برتن

تم ہی انصاف سے ذرا کہنا

آدمی ہے کہ ظُلم کا پُتلا

بکری کے جواب کے حسب ذیل تین شعر "بانگِ درا" میں موجود نہیں ہیں:—

اس شکایت سے منہ کو بند کرو

ٹیڑھا رستہ نہ تم پسند کرو

رہنے سہنے کو ہے مکاں ایسا

خوف سردی کا ہے نہ گرمی کا

اُس کے ہوتے خطر نہیں ہم کو!
شیر چیتے کا ڈر نہیں ہم کو!

ماں کا خواب

یہ نظم ابتداء میں ۲۴ اشعار پر مشتمل تھی۔ اُن میں سے صرف پندرہ اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہوئے۔ باقی ۹ اشعار یہ ہیں :۔

کوئی اُس سمے کا بیاں کیا کرے
اندھیرا خموشی بغلگیر تھے
سیاہی کا نقشہ تھا ایسا عجب
اُجالا کہیں نام کو بھی نہ تھا
ستارے فلک پر چمکتے نہ تھے
کہ ظلمت کے ڈر سے تھے سہمے ہوئے

یکایک دکھائی دیا چاندنا
ہُوا جس سے کچھ کچھ مجھے حوصلہ

بڑی دُور تھی مجھ سے یہ روشنی
مگر رفتہ رفتہ قریب آ گئی!

کہوں کیا جماعت وہ بچّوں کی تھی
کہ معصومیت چلتی پھرتی ہُوئی

"کہا میں نے پہچان کر میری جاں
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں"

مندرجہ بالا ایک شعر "بانگِ درا" میں موجود ہے اور حسبِ ذیل ترک شدہ اشعار کا مفہوم واضح کرنے کے لیے لکھا گیا ہے:

جدائی کے صدمے سہوں کس طرح؟
جو گزری ہے مجھ پہ کہوں کس طرح؟

پریشاں ترے غم میں رہتا ہے دل
عجب طرح کے رنج سہتا ہے دل

اجل سے بھی بدتر ہے جینا مرا
لُٹا دن دہاڑے خزینہ مرا

○

ایک مکڑا اور مکھّی

یہ نظم ۳۲ اشعار پر مشتمل تھی۔ جن میں سے ۲۵ اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہو گئے۔ باقی حسبِ ذیل ہیں :

ابتدائی ترتیب میں تیسرا شعر :

بڑھ کر کوئی شے ملنے ملانے سے نہیں ہے
ہو یہ بھی نہ دنیا میں تو کس کام کا جینا !

○

پانچواں شعر

ہر طرح سے تیار ہوں خدمت کو تمہاری
اوروں کی طرح مجھ کو دکھاوا نہیں آتا

بارھواں شعر

کیجے یہیں آرام کہ یہ آپ کا گھر ہے
اب وقت ہے کھانے کا یہیں کھائیے کھانا

تیرھواں شعر

ڈرتا ہوں کہ دشمن کہیں بیمار نہ ہو جائیں
رہ جائیں نہ پر تھک کے مجھے ہے یہی کھٹکا

بیسواں شعر

اِن باتوں سے قابو میں نہ آئے گی یہ مکھی
اب اور کوئی چاہیے دینا اِسے چکمہ

پچیسواں شعر

پہنائی ہے کیا آپ کو پوشاک سنہری !
پر آپ کے چیتے ہیں کہ چاندی کا ہے گہنا

ابتدائی ترتیب کے آخری دو شعر

لڑکو! مرے قصّے کو جو دانا ہو تو سمجھو
مکھی کی طرح ہو نہ کہیں حال تمھارا
پھنس جاتے ہیں جو سُنتے ہیں تعریف کی باتیں
لوگوں کی خوشامد پہ کہیں کان نہ دھرنا !

ھمدردی

یہ نظم انگریزی سے ماخوذ ہے۔ ابتدا میں یہ نظم ۱۶ اشعار پر مشتمل تھی۔ اُن میں سے آٹھ اشعار "بانگِ درا" میں شائع ہو گئے ہیں۔ جن کا پہلا شعر ہے :

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

باقی آٹھ اشعار جو "بانگِ درا" میں شامل نہیں، یہاں درج کیے جاتے ہیں:

بلبل

آنکھوں سے ٹپک رہے تھے آنسو
کہتا تھا کہ ہائے، اب کروں کیا؟

پھیلی ہے یہ رات کی سیاہی
رستہ نہیں گھونسلے کا ملتا!

خورشید کے ڈوبنے سے پہلے
گھر کو مجھے چاہیے تھا جانا

بچے مرے دیر سے ہیں بھوکے
دے گا انھیں کون جا کے دانا

مر جائیں نہ وہ غریب ڈر کر
گر جائیں نہ گھونسلے سے باہر

جگنو

روشن ہیں جو پر مرے تو مجھ کو
آسان ہے راہ کا دکھانا!
اوروں کے جو کام میں نہ آؤں
کس کام کا پھر مرا ہے جینا
بلبل کو اڑا یہ کہہ کے جگنو!
لے کر اُسے گھونسلے میں آیا

○

جہاں تک ہو سکے، نیکی کرو!

کہتے ہیں ایک سال نہ بارش ہوئی کہیں
گرمی سے آفتاب کی تپنے لگی زمیں

تھا آسمان پر نہ کہیں ابر کا نشاں
پانی ملا نہ جب تو ہوئیں خشک کھیتیاں

لالے پڑے تھے جان کے ہر جاندار کو
اُجڑے چمن ترستے تھے بہار کو

منہ تک رہی تھی خشک زمیں آسمان کا
امید ساتھ چھوڑ چکی تھی کسان کا!

بارش کی کچھ امید نہ تھی اُس غریب کو
یہ حال تھا کہ جیسے کوئی سوگوار ہو

اک دن جو اپنے کھیت میں آکر کھڑا ہُوا
پودوں کا حال دیکھ کے بیتاب ہو گیا
ہر بار آسماں کی طرف دیکھتا تھا وہ
بارش کے انتظار میں گھبرا رہا تھا وہ
ناگاہ ایک ابر کا ٹکڑا نظر پڑا
لاتی تھی اپنے ساتھ اُڑا کر جسے ہوا
پانی کی ایک بُوند نے تاکا اِدھر اُدھر
بولی وہ اُس کسان کی حالت کو دیکھ کر
ویران ہو گئی ہے جو کھیتی غریب کی
ہے آسمان پر نظر اس بدنصیب کی!
دل میں یہ آرزو ہے کہ اِس کا بھلا کرُوں
یعنی برس کے کھیت کو اس کے ہرا کرُوں

بوندوں نے جب سُنی یہ سہیلی کی گفتگو!
ہنس کر دیا جواب کہ اللہ رے، آرزو!
تو اک ذرا سی بوند ہے، اتنا بڑا یہ کھیت
تیرے ذرا سے نم سے نہ ہوگا ہرا یہ کھیت
تیری بساط کیا ہے کہ اس کو ہرا کرے!
ہو خود جو ہیچ کیا وہ کسی کا بھلا کرے!
اُس بوند نے مگر یہ بگڑ کر دیا جواب
کہہ دی وہ بات جس نے کیا سب کو لاجواب
مانا کہ ایک بوند ہوں، دریا نہیں ہوں مَیں
قطرہ ذرا سا ہوں کوئی چھینٹا نہیں ہوں مَیں
مانا کہ میرا نم کوئی دریا کا نم نہیں!
ہمّت تو میری بحر کی ہمّت سے کم نہیں!

نیکی کی راہ میں کبھی ہمت نہ ہارئیے !
مقدور ہو تو عمر اسی میں گزاریے

قربان اپنی جان کروں گی کسان پر
کیا تُوں گی میں ٹھہر کے یہاں آسمان پر !

نیکی کے کام سے کبھی رُکنا نہ چاہیے
اس میں کسی کے ساتھ کی پروا نہ چاہیے

لُو میں چلی، یہ کہہ کے روانہ ہوئی وہ بوند
بوندوں کی انجمن میں یگانہ ہوئی وہ بوند

ٹپ دے سے اس کی ناک پہ وہ بوند گر پڑی
سُوکھی ہوئی کسان کے دل کی کلی کِھلی !

دیکھا سہیلیوں نے تو حیران ہو گئیں
ہمت کے اس کمال پہ کی سب نے آفریں !

بولیں کہ چاہیے نہ سہیلی کو چھوڑنا
اچھا نہیں ہے منہ کو رفاقت سے موڑنا

ساتھی کے ساتھ سب کو برسنا ضرور ہے
گر ہم نہ ساتھ دیں تو مروّت سے دور ہے

یہ کہہ کے ایک ساتھ وہ بوندیں وہاں ہوئیں
چھینٹا سا بن کے کھیت کے اوپر برس گئیں!

قسمت کھلی کسان کی بگڑی ہوئی بنی!
سوکھی ہوئی غریب کی کھیتی ہری ہوئی!

پھر سامنے نظر کے بندھا آس کا سماں
تھی آس آس پاس گیا یاس کا سماں

اُجڑا ہوا جو کھیت تھا، آخر ہرا ہوا
سارا یہ ایک بوند کی ہمت کا کام تھا

دیکھی گئی نہ اُس سے مصیبت کسان کی
بے تاب ہو کے کھیت پہ آگیں کے برس گئی

ننھی سی بوند اور یہ ہمت، خدا کی شان!
یہ فیض، یہ کرم، یہ مروّت، خدا کی شان!

چاند اور شاعر

شاعر

اک رات میرے دل میں جو کچھ آگیا خیال
یُوں چودھویں کے چاند سے میں نے کیا سوال
اے چاند! تجھ سے رات کی عزّت ہے، لاج ہے
سُورج کا راج دن کو تو راتُ شب کو راج ہے

تو نے یہ آسمان کی محفل سجائی ہے
تو نے زمیں کو نور کی چادر اڑھائی ہے
تو وہ دیا ہے جس سے زمانے میں نور ہے
ہے تو فلک پہ، نور ترا دُور دُور ہے!
پھیکی پڑی ہوئی ہے ستاروں کی روشنی
گویا کہ اس چمن پہ خزاں کی ہوا چلی!
تیری چمک کے سامنے شرما گئے ہیں یہ
تیری ہوا بندھی ہے تو مرجھا گئے ہیں یہ
اِس وقت تیرے سامنے سُورج بھی مات ہے
دولھا ہے تو نجوم کی محفل برات ہے
پائی ہے چاندنی یہ کہاں سے بتا مجھے
یہ نور، یہ کمال، کہاں سے ملا تجھے؟

مجھ کو بھی آرزو ہے کہ ایسا کمال ہو
تیری طرح کمال مرا بے مثال ہو

روشن ہو میرے دم سے زمانہ اسی طرح
دُنیا میں اپنا نام نکالوں تری طرح

حاصل کروں کمال بنوں چودھویں کا چاند
تو ہے فلک کا چاند، بنوں میں زمیں کا چاند

ہر ایک کی نظر میں سماؤں اِسی طرح
شہرت کے آسمان پہ چمکوں اِسی طرح

چاند

میرا سوال سُن کے کہا چاند نے مجھے
لے بھید اپنے نُور کا کہتا ہوں میں تجھے

سُورج اگر نہ ہو تو گزارا نہیں مرا
مانگا ہُوا ہے نُور یہ اپنا نہیں مرا
سُورج کے دم سے مجھ کو یہ حاصل کمال ہے
کامل اُسی کے نور سے میرا ہلال ہے
پھرتا ہُوں روشنی کی تمنّا میں رات دن
رہتا ہُوں میں کمال کے سودا میں رات دن
مجھ کو اُڑائے پھرتی ہے خواہش کمال کی
کر پیروی جہان میں میری مثال کی!
بے فائدہ نہ اپنے دنوں کو خراب کر
میری طرح تلاش کوئی آفتاب کر
کہتے ہیں جس کو علم وہ اک آفتاب ہے
یکتا ہے، بے مثال ہے اور لاجواب ہے

ایسے کمال کی ہے تمنّا اگر تجھے
تو نور جا کے مانگ اُسی آفتاب سے

ہے چاند کے کمال کو خطرہ زوال کا
رہتا ہے ہر گھڑی اُسے دھڑکا زوال کا

محفوظ اِس خطر سے ھُنر کا کمال ہے
گھٹنے کا اُس کو ڈر ہے نہ خوفِ زوال ہے

دنیا میں زندگی کا نہیں اعتبار کچھ
رہتی ہے اس چمن میں ہمیشہ بہار کچھ؟

انساں کو فکر چاہیے ہر دم کمال کی
"کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی"

محنت

وہی لوگ پاتے ہیں عزّت زیادہ
جو کرتے ہیں دُنیا میں محنت زیادہ!

اِسی میں ہے عزّت خبردار رہنا!
بڑا دُکھ ہے دنیا میں بے کار رہنا

اسی سے ہے آباد نگری جہاں کی
یہ دنیا میں بنیاد ہے ہر مکاں کی

بڑائی بشر کو اِسی سے مِلی ہے
نکمّی جو گزرے وہ کیا زندگی ہے

زمانے میں عزّت حکومت یہی ہے
بڑی سب سے دنیا میں دولت یہی ہے!

حقیقت جو محنت کی پہچانتے ہیں
اسے کیمیا سے سوا جانتے ہیں

کوئی بڑھ کے محنت سے سونا نہیں ہے
کہ اِس زر کو چوری کا کھٹکا نہیں ہے!

جہاں میں اگر کیمیا ہے تو یہ ہے
غریبی کے دُکھ کی دوا ہے تو یہ ہے

ہری کھیتیاں جو نظر آ رہی ہیں
ہمیں شان محنت کی دِکھلا رہی ہیں

نہیں کرتے دُنیا میں نادان محنت
جو سمجھیں تو سونے کی ہے کان محنت

اِسی سے زمانے میں دولت بڑھے گی
جو دولت بڑھے گی تو عزت بڑھے گی

کوئی اس کو سمجھے تو اکسیر ہے یہ
بڑا بن کے رہنے کی تدبیر ہے یہ

یہ کل وہ ہے چلتے ہیں سب کام جس سے
نکلتا ہے انسان کا نام جس سے

جو محنت نہ ہوتی، تجارت نہ ہوتی
کسی قوم کی شان و شوکت نہ ہوتی

سہارا ہمارا تمھارا یہی ہے
اندھیرے گھروں کا اُجالا یہی ہے

بڑے کام کی چیز ہے کام کرنا
جہاں کو اِسی کام سے رام کرنا!

گڈریوں کو شاہنشہی اِس نے دی ہے
کولمبس کو دنیا نئی اِس نے دی ہے

کھڑا ہے یہ سنسار محنت کی کل پر
یہ سب کارخانہ ہے اس کل کے بل پر
بناتی ہے یہ شہر نگری، بنوں کو
بساتی ہے اُجڑی ہوئی بستیوں کو
جو ہاتھوں سے اپنے کمایا وہ اچھا
جو ہو اپنی محنت کا پیسہ وہ اچھا
مری جان! غافل نہ محنت سے رہنا
اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

بچّوں کے لیے چند نصیحتیں

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں
اِک ذرا انسان میں چلنے کی ہمّت چاہیے

مل نہیں سکتی نکموں کو زمانے میں مُراد
کامیابی کی جو ہو خواہش تو محنت چاہیے

خاک محنت ہو سکے گی ہو نہ جب ہاتھوں میں زور
تندرستی کے لیے ورزش کی عادت چاہیے

خوش مزاجی سا زمانے میں کوئی جادُو نہیں
ہر کوئی تجھ سے کہے ایسی طبیعت چاہیے!

ہنس کے غم آرام کر لیتا ہے ہر انسان کو
سب سے میٹھا بولنے کی تم کو عادت چاہیے

ایک ہی اللہ کے بندے ہیں سب چھوٹے بڑے
اپنے ہم جنسوں سے دنیا میں محبت چاہیے!

ہے بُرائی سی بُرائی کام کل پر چھوڑنا
آج سب کچھ کر کے اُٹھو گر فراغت چاہیے

جو بُروں کے پاس بیٹھے گا بُرا ہو جائے گا
نیک ہونے کے لیے نیکوں کی صحبت چاہیے

ساتھ والے دیکھنا تم سے نہ بڑھ جائیں کہیں
جوش ایسا چاہیے ایسی حمیت چاہیے!

حکمراں ہو کوئی ہو اپنا ہو یا بیگانہ ہو
دی خُدا نے جس کو عزت اُس کی عزت چاہیے

دیکھ کر چلنا کچل جائے نہ چیونٹی راہ میں
آدمی کو بے زبانوں سے بھی اُلفت چاہیے

ہے اسی میں بھید عزت کا اگر سمجھے کوئی
چھوٹے بچوں کو بزرگوں کی اطاعت چاہیے

علم کہتے ہیں جسے سب سے بڑی دولت ہے یہ
ڈھونڈ لو اس کو اگر دُنیا میں عزت چاہیے

سب بُرا کہتے ہیں لڑنے کو بُری عادت ہے یہ
ساتھ کے لڑکے جو ہوں اُن سے رفاقت[1] چاہیے

ہوں جماعت میں شرارت کرنے والے بھی اگر
دُور کی اُن سے فقط صاحب سلامت چاہیے

دیکھنا آپس میں پھر نفرت نہ ہو جانے کہیں
اس قدر حد سے زیادہ بھی نہ بِلّت چاہیے

باپ دادوں کی بڑائی پر نہ اترانا کبھی!
سب بڑائی اپنی محنت کی بدولت چاہیے

چاہتے ہو گر کہ سب چھوٹے بڑے عزت کریں
شرم آنکھوں میں، نگاہوں میں مروت چاہیے

بات اونچی ذات میں بھی کوئی اترانے کی ہے؟
آدمی کو اپنے کاموں کی شرافت چاہیے!

---

[1] میل ملاپ۔ دوستی

گر کتابیں ہو گئیں میلی تو کیا پڑھنے کا لطف
کام کی چیزیں ہیں جو اُن کی حفاظت چاہیے

گھوڑوں کی مجلس

اک روز کسی گھوڑے کے دل میں یہ سمائی
انسان مری قوم سے کرتا ہے بُرائی!
رکھا ہے مرے بھائیوں کو اس نے جکڑ کر
تدبیر ہو ایسی کہ ملے اُن کو رہائی!
میں قوم کی ذلت نہ کبھی دیکھ سکوں گا
اِک آگ سی ہے اس نے مرے جی کو لگائی
یہ ٹھان کے جنگل کے رفیقوں کو بُلایا
سب آئے کہ اس بات میں تھی سب کی بھلائی

حاضر ہوئے بُوڑھے بھی بچھیرے بھی جواں بھی
دیتے ہوئے انسان کی سختی کی دُہائی

پہلے تو ہری گھاس سے کی اُن کی تواضع
مہمانوں کو پھر بات جو تھی دل کی بتائی

اک گھوڑے کو کُرسی پہ صدارت کی بٹھا کر
سب نے یہ کہا آپ کریں راہنمائی

ہونے لگا گھوڑوں کا بڑی دُھوم سے جلسہ
دینے لگی اس قوم کی اک شان دکھائی

کچھ دیر تو ہوتی رہیں آپس میں صلاحیں
ہر ایک نے تدبیر رہائی کی بتائی

مجلس سے اُٹھا آخرِ کار ایک بچھیرا
اور اُٹھ کے متانت سے زبان اپنی ہلائی

تقریر یہ سو جان سے صدقے تھی فصاحت
تھی گھوڑے کی باتوں میں قیامت کی صفائی
بولا کہ مری قوم میں غیرت نہیں باقی
کس طرح ہو پھر غیر کے ہاتھوں سے رہائی
جینا جو ہمارا ہے وہ ذلّت کا ہے جینا
ہم نے تو بزرگوں کی بھی عزّت ہے گنوائی
ہم گاڑیاں انسان کی کھینچیں، یہ غضب ہے
محنت کریں ہم اور یہ کھا جائے کمائی
سردی سے رہیں ہم تو طویلوں میں ٹھٹھرتے
لیٹے یہ حویلی میں لیے گرم رضائی
گھڑ دوڑ میں ہم اپنا بہاتے ہیں پسینہ
جو اس کی بھلائی ہے وہ ہے اپنی بُرائی

کیا کہیے مصیبت ہمیں پڑ جاتی ہے کیسی
ہو جائے جو ظالم کے قبیلوں میں لڑائی
لوہے کی لگامیں ہیں تو چمڑے کی ہے چابک
افسوس کہ غیرت نہ مری قوم کو آئی
روئے کوئی اس قوم کے دکھڑے کو کہاں تک
ہم سمجھے ہیں اے 'وائے غلامی ہیں' بڑائی
اے قوم! یہ اچھا نہیں ہر روز کا جلنا
زیبا ہے ہمیں قید سے انساں کی نکلنا
تقریر ہوئی ختم تو بیٹھا وہ بچھیرا!
ہر گھوڑے نے مجلس میں دلیلوں کو سراہا
ہر بات بچھیرے کی سراہی گئی لیکن
کچھ کہنے پہ آمادہ تھا اک اور بھی گھوڑا

لاغر تھا بہت گرچہ بڑھاپے کے سبب سے
اُٹھا کر اسے قوم کو تھا راہ پہ لانا!
بولا کہ مرے دوست کی باتیں ہیں بہت خوب
پر جوشِ جوانی نے کیا ہے اُسے اندھا
مانا کہ اُسے قوم کی ذلت نہیں بھاتی
بچّہ ہے ابھی اس نے زمانہ نہیں دیکھا!
ہے زور دیا آپ نے انساں کے ستم پر
تقریر کو ہے خوب مثالوں سے سجایا
سختی سے ہمیں پیش وہ آتا ہے یہ مانا!
سختی میں جو راحت ہو تو سختی ہے گوارا
انسان کے احسان کو سمجھا نہیں تم نے
دیتا ہے طویلوں میں تمھیں وقت پہ دانا

رہنے کو طویلوں میں سمجھتے ہو بُرا تم!
جنگل کی رہائش میں ہے سو طرح کا کھٹکا

دن رات وہاں گھات میں رہتے ہیں درندے
پینے کا جو پانی ہے وہ اکثر نہیں ملتا

ہے قید میں انسان کی راحت ہی سراسر
ہر حال میں ہے اُس کی غلامی ہمیں زیبا

دن آتے ہیں ایسے بھی کہ بارش کی کمی سے
ہو گھاس نہ پیدا تو یہ رکھتا ہے ذخیرا

یہ آپ پہنتا ہے جو کمخواب کے کپڑے
زربفت کی جھولوں سے ہے تم کو بھی سجاتا

بیمار جو ہو جاؤ تو کرتا ہے دوا بھی
کرتا ہے ہمارے لیے نقصاں بھی گوارا

گھڑ دوڑ کے گھوڑوں کی جو ہوتی ہے تواضع
آرام وہ حیواں کو میسر نہیں ہوتا

آرام ہیں لاکھوں ہمیں انسان کے دم سے
میرا تو شکایت پہ کبھی لب نہ کھلے گا

میں نے تو بتا دی ہے تمہیں سب کے بھلے کی
مانے جو نہ کوئی تو مجھے کچھ نہیں پروا

ان باتوں سے حیران سے کچھ رہ گئے گھوڑے
تقریر وہ کی اُس نے کہ جادو تھی سراپا

سب مان گئے دُور شکایت ہوئی سب کی
تھی بُوڑھے کی تقریر میں تاثیر غضب کی!

○

شہد کی مکھی

اِس پھُول پہ بیٹھی، کبھی اُس پھُول پہ بیٹھی
بتلاؤ تو کیا ڈھونڈتی ہے شہد کی مکھی

کیوں آتی ہے، کیا کام ہے گلزار میں اس کا
یہ بات جو سمجھاؤ تو سمجھیں تمھیں دانا!

چہکارتے پھرتے ہیں جو گلشن میں پرندے
کیا شہد کی مکھی کی ملاقات ہے اِن سے

عاشق ہے یہ قمری کی کہ بلبل پہ ہے شیدا
یا کھینچ کے لاتا ہے اِسے سیر کا چسکا

دل باغ کی کلیوں سے تو اٹکا نہیں اس کا؟
بھاتا ہے اسے اُن کے چٹکنے کا تماشا

سبزے سے ہے کچھ کام کہ مطلب ہے صبا سے؟
یا پیار ہے گلشن کے پرندوں کی صدا سے؟

بھاتا ہے اسے پھول پہ بلبل کا چہکنا؟
یا سرو پہ بیٹھے ہوئے قمری کا یہ گانا؟

پیغام کوئی لاتی ہے بلبل کی زبانی؟
یا کہتی ہے یہ پھول کے کانوں میں کہانی؟

کیوں باغ میں آتی ہے؟ یہ بتلاؤ تو جانیں
کیا لینے کو آتی ہے؟ یہ سمجھاؤ تو جانیں

بے وجہ تو آخر کوئی آنا نہیں اس کا
ہشیار ہے مکھی، اِسے غافل نہ سمجھنا

بے سود نہیں باغ میں اِس شوق سے اُڑنا
کچھ کھیل میں یہ وقت گنواتی نہیں اپنا

کرتی نہیں کچھ کام اگر عقل تمہاری
ہم تم کو بتاتے ہیں سنو بات ہماری

کہتے ہیں جسے شہد وہ اک طرح کا رس ہے
آوارہ اسی چیز کی خاطر یہ مگس ہے

رکھا ہے خدا نے اِسے پھولوں میں چھپا کر
مکھی اِسے لے جاتی ہے چھتّے میں اُڑا کر

ہر پھول سے یہ چوستی پھرتی ہے اسی کو
یہ کام بڑا ہے، اِسے بے سود نہ جانو!

مکھی یہ نہیں ہے، کوئی نعمت ہے خدا کی
مِلتا نہ ہمیں شہد، یہ مکھی جو نہ ہوتی

اِس شہد کو پھولوں سے اُڑاتی ہے یہ مکھی
خود کھاتی ہے، اوروں کو کھلاتی ہے یہ مکھی

اِنسان کی، یہ چیز غذا بھی ہے، دوا بھی!
قوّت ہے اگر اس میں تو ہے اس میں شفا بھی

رکھتے ہو اگر ہوش تو اِس بات کو سمجھو
تم شہد کی مکھی کی طرح علم کو ڈھونڈو

یہ علم بھی اک شہد ہے اور شہد بھی ایسا
دُنیا میں نہیں شہد کوئی اِس سے مُصفّا

ہر شہد سے جو شہد ہے میٹھا وُہ یہی ہے
کرتا ہے جو انسان کو دانا وُہ یہی ہے

یہ عقل کے آئینے کو دیتا ہے صفائی
یہ شہد ہے انساں کی، وہ مکھی کی کمائی

سچ سمجھو تو اِنسان کی عظمت ہے اِسی سے
اس خاک کے پُتلے کو سنوارا ہے اِسی نے

پھولوں کی طرح اپنی کتابوں کو سمجھنا
چسکا ہو اگر تم کو بھی کچھ علم کے رَس کا

حیاتِ اقبال

تصاویر میں

کتاب کے اس آخری اور اہم ترین باب میں حکیم الامت علامہ اقبال کی زندگی اور علمی و سیاسی سرگرمیوں سے متعلق ہر دور، ہر سفر اور ہر بڑے اجتماع یا تقریب کی یادگار تصاویر جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تعارفی سطور کا ہر تصویر کے ساتھ دینا ممکن نہ تھا۔ اس لیے وہاں صرف سنہ اور مقام درج ہیں۔ صفحات کی ترتیب کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ہر تصویر کا نمبر اور اس کے متعلق مفصل معلومات و توضیحات ذیل میں شائع کی جارہی ہیں۔ جلد اول کی بعض تصاویر محض حیاتِ اقبال کے باب کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے شامل کی گئی ہیں۔ (مؤلف)

سنہ ۱۸۹۹ء

(۱) علامہ اقبال کے عہدِ شباب کی ایک نادر تصویر۔

سنہ ۱۹۰۱ء

(۲) سنہ ۱۹۰۱ء میں امرتسر میں پہلی کشمیری کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں نواب سر سلیم اللہ مہمانِ خصوصی تھے۔ اس تاریخی اجتماع کی تصویر میں علامہ اقبال کرسیوں کی صف میں دائیں طرف سے پہلے نمبر پر تشریف فرما

ہیں۔ تیسرے نمبر پر خواجہ الف دین وکیل اور ان سے آگے خواجہ احمد دین ایڈووکیٹ بیٹھے ہیں۔ فرشی نشست میں دوسرے کا مڈین کے ساتھ منشی محمد الدین فوقؔ بھی نظر آتے ہیں۔

۱۹۰۴ء

(۳) مشاہیر علم و دانش کا یہ اجتماع اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہے کہ ایسی ممتاز شخصیتیں اتنی بڑی تعداد میں شاذ و نادر ہی جمع ہوتی ہیں۔ مشاہیر ادب کی اس یکجا تصویر کی تفصیل درج ذیل ہے ——

فرش پر بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں: سر عبدالقادر۔ حافظ ساجد علی وکیل، اورنگ آباد۔ ظفر عمر۔

کرسیوں پر پہلی صف، دائیں سے بائیں: غلام محمد منشی۔ سر اکبر حیدری۔ نواب وقار الملک۔ حکیم محمد اجمل خاں۔ مولٰینا الطاف حسین حالیؔ۔ عزیز مرزا۔ محسن الملک، مرزا محمود علی خاں۔ منشی محبوب عالم۔

کرسیوں پر دوسری صف، دائیں سے بائیں: علی الدین حسن۔ مولٰینا شبلی نعمانی۔ پروفیسر آرنلڈ۔ نذیر احمد۔ نواب ابوالحسن خاں۔

تیسری صف میں کھڑے ہوئے، دائیں سے بائیں: مولٰینا ظفر علی خاں (دستار میں) علامہ محمد اقبال۔ مولوی نور المنیب اللہ حیدر آبادی (شملے میں)۔

چوتھی صف میں دائیں سے بائیں: ابوالحسن۔ خواجہ غلام الثقلین۔

حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مسعود علی محوی وغیرہ۔

۱۹۰۷ء

(۴) کیمبرج یونیورسٹی انگلستان میں علامہ (تیسرے نمبر پر بیٹھے ہوئے) ایک پکنک کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ پس منظر میں سید علی بلگرامی کی قیامگاہ ہے۔ (۲۲ اپریل)

(۵) ہائیڈل برگ جرمنی میں علامہ رفیق طلبا اور میزبان خاتون کے ہمراہ (دائیں طرف)

(۶) عالم نوجوانی میں علامہ کی ایک دلکش تصویر۔

(۷) ہائیڈل برگ میں ڈاکٹر اقبال عطیہ بیگم فیضی سے مصروف گفتگو ہیں۔

(۸) قیام یورپ کے دوران علامہ کی ایک منفرد تصویر۔

(۹) میونخ جرمنی میں قیام کا ایک گروپ فوٹو۔ درمیانی صف میں بائیں طرف سے پہلے نمبر پر علامہ اقبال تشریف فرما ہیں۔

(۱۰) علامہ مغربی لباس میں۔ گہری سوچ کا ایک انداز۔

۱۹۰۸ء

(۱۱) نواب وقار الملک مشتاق احمد نے دسمبر ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور کا سنگ بنیاد رکھا۔

منشی محمد منیر سب جج، میاں محمد شفیع، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مسٹر ایجرٹن ڈپٹی کمشنر اور دوسرے معززین اس تقریب میں شریک ہوئے۔ تصویر کے درمیان میں میاں محمد شفیع کے پیچھے ڈاکٹر محمد اقبال اور درمیان میں بیٹھے ہوئے اس اسکول کے

بائیں میاں عبدالعزیز نظر آتے ہیں۔

۱۹۱۰ء

(۱۲) گورنمنٹ کالج لاہور کا ایک گروپ فوٹو۔ علامہ اقبال اگلی صف میں دائیں سے تیسرے نمبر پر بیٹھے ہیں۔ علامہ اُن دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔

۱۹۱۱ء

(۱۳) شاعرِ مشرق (اقبال) شاہی مسجد لاہور کے ایک بڑے اجتماع میں طرابلس کے شہیدوں پر اپنی معرکہ آرا نظم پڑھ رہے ہیں۔

(۱۴) علامہ اقبال دائیں طرف سے تیسرے نمبر پر، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء کی عیادت کے موقع پر۔ اُن کے عزیز دوست فقیر سید افتخار الدین بائیں طرف سے پہلے نمبر پر بیٹھے ہیں۔ میاں عبدالعزیز علیل ہیں اور اُن کا سر ڈاکٹر اقبال کے زانو پر رکھا ہے۔ یہ یادگار تصویر ۱۹۱۱ء میں فقیر سید افتخار الدین (جو اُن دنوں ہوشیار پور میں اسسٹنٹ آفیسر تھے) کی قیامگاہ پر لی گئی۔

۱۹۲۰ء

(۱۵) علامہ فلسفہ و حکمت کی نکتہ آفرینیوں کے ساتھ ساتھ ایک لائق وکیل اور مشیرِ قانونی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اس تصویر میں وہ بیرسٹر ایٹ لاء کی حیثیت سے کسی قانونی دستاویز کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں۔

(۱۶) علامہ کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہیں۔ نواب سر ذوالفقار علی خان اُن کے

شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے کھڑے ہیں۔

۱۹۲۲ء

(۱۷) قیامِ شملہ کا ایک یادگار گروپ فوٹو۔ دائیں طرف سے پہلے علامہ اقبال اور اُن کے بعد ہز ایکسیلینسی سردار عبدالقدوس خاں اور نواب سر ذوالفقار علی خاں تشریف فرما ہیں۔ پچھلی صف میں نوابزادہ رشید علی خاں اور نوابزادہ خورشید علی خاں۔

(۱۸) علامہ لائبریری میں۔ یہ تصویر بھی اُن کے دورِ وکالت کی یاد دلاتی ہے۔

(۱۹) شملے میں لی گئی یہ تصویر علامہ کو ایک درویش اور مفکر کے انداز میں پیش کر رہی ہے۔

(۲۰) علامہ مغربی لباس میں کسی تقریب یا اجلاس میں شرکت کے موقع پر۔ چونکہ روز مرّہ یہ لباس پہننا اُن کا معمول نہ تھا۔

۱۹۲۵ء

(۲۱) علامہ اقبال کی یہ نادر تصویر اس دور کی یاد دلاتی ہے، جب وہ جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے کے "دیوانِ مغربی" کے جواب میں اپنی معرکہ آرا کتاب "پیامِ مشرق" شائع کر چکے تھے اور اس کتاب نے اندرونِ ملک اور سارے یورپ میں تہلکہ برپا کر دیا تھا۔

۱۹۲۶ء

(۲۲) مولوی سیّد میر حسن کے صاحبزادے ڈاکٹر سیّد علی نقی کو گورنر ہاؤس، پنجاب میں دی گئی الوداعی پارٹی کا گروپ فوٹو۔ درمیان میں گورنر پنجاب سر میلکم ہیلی۔ دائیں طرف ڈاکٹر اقبال اور بائیں طرف سیّد علی نقی۔

۱۹۲۷ء

(۲۳) ڈاکٹر سر محمد اقبال خالصہ کالج، امرتسر کی ایک تقریب میں۔

(۲۴) ڈاکٹر صاحب اپنے علم و فضل کے باعث تمام فرقوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ میزبان سکھ معززین کے ہمراہ اُن کی یہ تصویر اس کی ایک مثال ہے۔

۱۹۲۸ء

(۲۵) یہ تصویر علامہ کے قیام مدراس کی آئینہ دار ہے۔ جب وہ "تشکیل جدید" کے موضوع پر شہرۂ آفاق خطبات دینے کے سلسلے میں وہاں تشریف لے گئے علامہ اساتذہ، طلباء اور معززین شہر کے ہمراہ دائیں طرف سے آٹھویں نمبر پر بیٹھے ہیں

۱۹۲۹ء

(۲۶) میسور یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے موقع کی ایک یادگار تصویر کرسیوں پر بائیں طرف سے چوتھے نمبر پر میسور اسمبلی کے ممتاز ممبر محمد آبا، پروفیسر جے۔ سی رولو، پرنسپل مہاراجہ کالج جو بعد میں وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اُن کے بعد علامہ اقبال تشریف فرما ہیں۔ فلسفہ کے پروفیسر آر۔ واڈیا اور ڈاکٹر گوپال

سوامی اُن کے بائیں طرف بیٹھے ہیں۔

بائیں طرف سے آٹھویں نمبر پر ایس۔ کے عبدالعزیز جواب نیشنل بنک آف پاکستان، کراچی کے ایک افسر ہیں، کھڑے ہیں۔

(۲۷) حکیم الامت علامہ اقبال — سرنگاپٹم، میسور میں سلطان ٹیپو کے مزار پر۔ ایک شہیدِ آزادی، دوسرا غمگسارِ انسانیت — علامہ نے اپنی مشہور نظم میں اس جلیل القدر مجاہد کو بڑے خلوص کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

(۲۸) مدراس اور میسور کے بعد علامہ حیدرآباد دکن بھی تشریف لے گئے۔ اس موقع پر اُن کے اعزاز میں بہت سی استقبالیہ تقاریب منعقد ہوئیں۔ یہ تصویر حیدرآباد دکن کی ایک یادگار مجلس کی ہے۔ علامہ درمیان میں پھولوں کے ہار پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔

(۲۹) علامہ اقبال مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں۔ دائیں طرف سے:

سجاد حسین۔ ریز باتھم۔ سر محمد اقبال۔ سر راس مسعود۔ غلام السیدین اور ڈاکٹر خالد شیلڈرک۔

سر راس مسعود اور علامہ اقبال کے درمیان گہری دوستی اور بے تکلفی اس تصویر کی دلچسپی کا نمایاں پہلو ہے۔

(۳۰) علامہ اپنے فرزند جاوید اقبال کے ہمراہ۔ بڑے باپ کے بڑے عزیز فرزند جن کے نام سے علامہ نے اپنی شاہکار تصنیف "جاوید نامہ" کو منسوب کیا۔ شیروانی، شلوار اور افغانی ٹوپی پہنے ہوئے قومی لباس میں

علامہ اور ان کے فرزند کی یہ تصویر اپنی نوعیت کی واحد دلچسپ تصویر ہے۔ (۱۷ فروری)

(۳۱) علامہ اقبال میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں۔ حیدر آباد دکن کے نوجوان طلبا کے ہمراہ۔

(۳۲) غازی علم الدین کے جنازے کا ایک منظر۔ علامہ اقبال پہلی صف میں، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا کے ہمراہ۔ میاں محمد شفیع بائیں طرف کھڑے ہیں۔

۱۹۳۰ء

(۳۳) علامہ اقبال ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں شرکت کے لیے سر عبداللہ ہارون کے ہمراہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ گاڑی کے قریب دائیں طرف سر عبداللہ ہارون کے صاحبزادے یوسف ہارون کھڑے ہیں۔

(۳۴) اس تصویر میں آپ علامہ اقبال کو آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ آباد اجلاس میں تاریخی خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ جس میں انھوں نے مسلم اکثریتی صوبوں کے وفاق کی صورت میں پہلی بار نظریۂ پاکستان پیش کیا تھا۔

۱۹۳۱ء

(۳۵) یہ تصویر ۱۹۳۱ء میں جاری شدہ اس پاسپورٹ سے لی گئی ہے، جس پر انھوں نے انگلستان، پیرس، روم، فلسطین اور افغانستان کا سفر کیا تھا۔

(۳۶) دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جاتے ہوئے جب علامہ بمبئی پہنچے تو وہاں اپنے عزیز دوست صلاح الدین سلجوقی افغان قونصل

کے ہاں قیام کیا۔ اس تصویر میں اُنھیں بمبئی ریلوے اسٹیشن پر خوش آمدید کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

دائیں سے بائیں: شوکت کاظمی (افغان کمرشل اٹیچی) علامہ اقبال، صلاح الدین سلجوقی افغان قونصل بمبئی، سکرٹری سفارت افغانستان میر ریاض احمد۔

(۳۷) علامہ کی ایک بالکل فطری تصویر، جو امریتا شیر گل نے قیام پیرس کے دوران کھینچی

(۳۸) پیرس میں لی گئی ایک اور تصویر۔ علامہ کسی گہری سوچ میں۔

(۳۹) علامہ اقبال، دائیں طرف (شیروانی اور پگڑی میں) اور چودھری سر ظفر اللہ خاں (بائیں طرف) بکنگھم پیلیس، لندن میں داخل ہو رہے ہیں۔

(۴۰) دُوسری گول میز کانفرنس لندن میں ڈاکٹر محمد اقبال (دائیں طرف) اُن کے بائیں طرف مولنا شوکت علی اور دائیں طرف دُوسرے نمبر پر سر عبد القادر اور پچھلے نمبر پر سید امجد علی بیٹھے ہیں۔

(۴۱) علامہ ۱۹۳۱ء میں لندن سے واپسی پر فلسطین تشریف لے گئے، جہاں اُنھیں مؤتمر عالم اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

اس تاریخی اہمیت کے گروپ فوٹو میں وہ دائیں سے چوتھے نمبر پر تشریف فرما ہیں۔ علامہ اور عرب کے درمیان مفتی اعظم امین الحسینی بیٹھے ہیں۔

(۴۲) مؤتمر عالم اسلامی کی جو کانفرنس دسمبر ۱۹۳۱ء مطابق رجب ۱۳۵۰ھ یروشلم (بیت المقدس) میں منعقد ہوئی اور جس میں عالم عرب اور دُنیائے اسلام

کے سرکردہ نمائندوں نے شرکت کی۔ علامہ اقبال اُن میں بطورِ خاص
شامل تھے۔ اگلی صف میں دائیں طرف علامہ اقبال اُن کے بعد السید
عبدالعزیز اور شیخ عبدالقادر المدقر بیٹھے ہیں۔

(۴۳) ایک اہم گروپ فوٹو جو غالباً بمبئی کی کسی تقریب میں لیا گیا۔ علامہ
مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے درمیان میں تشریف فرما ہیں۔

۱۹۳۲ء

(۴۴) انگلستان میں منعقد ہونے والی تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے
والے مسلم مندوبین کی ایک یادگار تصویر:
دائیں سے بائیں: ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، حافظ ہدایت حسین،
ڈاکٹر سر محمد اقبال، ایچ۔ ایچ آغا خاں، چودھری ظفر اللہ خاں، اے۔ ایچ
غزنوی اور سید امجد علی۔

(۴۵) نیشنل لیگ لندن کی استقبالیہ دعوت میں علامہ اقبال، سید امجد علی،
لیڈی سائمن اور دیگر معزز مہمان۔

(۴۶) تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں مقیم مسلمان طلبا نے ایک
استقبالیہ علامہ سر محمد اقبال کے اعزاز میں ترتیب دیا۔ اس موقع
پر کئی دلچسپ تقریریں ہوئیں، جن میں علامہ کی ہمہ گیر شخصیت پر روشنی
ڈالی گئی۔

دائیں طرف سے پہلے نمبر پر سلطان خاں شطرنج کے چیمپئن

دُوسرے نمبر پر ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی۔ تیسرے نمبر پر قائدِ اعظم محمد علی جناح اور چوتھے نمبر پر ڈاکٹر سر محمد اقبال تشریف فرما ہیں۔

(۴۷) علامہ اقبال اپنے چند عقیدت مندوں کے ساتھ۔

کھڑے ہُوئے بائیں طرف سے پہلے، چودھری رحمت علی مرحوم۔

بیٹھے ہُوئے بائیں طرف سے پہلے، پیر حسن الدین، علامہ اقبال اور میاں عبد الحق۔

۱۹۳۳ء

(۴۸) حکیم الامت علامہ اقبال تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد سپین بھی گئے اور وہاں اسلامی دورِ اقتدار ختم ہونے کے تقریباً سات سو سال بعد اُنھوں نے مسجدِ قرطبہ میں پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی حامل یہ مسجد اب گرجا بن چکی ہے۔ علامہ کے قلب پر اسلامی عظمتِ پارینہ اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا جو اثر ہُوا۔ اس کی پوری کیفیت اُنھوں نے اپنی مشہور نظم "مسجدِ قرطبہ" میں بیان کی ہے۔

(۴۹) اُن یادگار لمحوں کی ایک اور جھلک، جو ملّتِ اسلامیہ کے عظیم مفکر نے مسجدِ قرطبہ میں گزارے اور محراب کے درمیان کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔

(۵۰) تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے بعد علامہ اقبال یورپ سے وطن واپس آئے تو اُن کے اعزاز میں

لاہور کے قومی کارکنوں اور معززین شہر نے بورڈنگ ہوٹل میں ایک استقبالیہ دعوت دی۔

بائیں طرف سے دُوسرے نمبر پر علامہ تشریف فرما ہیں۔ دوسرے شرکائے تقریب میں جسٹس دین محمد اور پیر حمید الدین کے والد پیر غیاث الدین نمایاں ہیں۔

(۵۱) علامہ اقبال، مولٰنا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کی ایک یادگار تصویر، جو سفرِ افغانستان کے موقع پر لی گئی۔

علامہ بائیں طرف سے پہلے نمبر پر کھڑے ہیں۔ ہندوستان سے علماء کا یہ وفد وزارتِ معارفِ افغانستان کی دعوت پر گیا تھا۔

(۵۲) افغانستان میں قیام کے دوران کی ایک نادر تصویر۔

دائیں سے تیسرے نمبر پر علامہ اقبال اور اُن کے دائیں طرف سر راس مسعود کھڑے ہیں۔

(۵۳) کابل کی دعوتِ استقبالیہ کا ایک منظر، جو علامہ اقبال، مولٰنا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے اعزاز میں دی گئی۔

سر راس مسعود دائیں طرف اور علامہ اقبال و سید سلیمان ندوی بائیں طرف تشریف فرما ہیں۔

(۵۴) علامہ کی ایک انفرادی تصویر، جس میں وجاہت کا پہلو نمایاں ہے۔

(۵۵) علامہ کی یہ تصویر لباس کے متعلق اُن کے رجحانات کا پتہ دیتی ہے اور

اُس زمانے سے متعلق ہے، جب علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق تصنیف "جاوید نامہ" شائع ہو کر علمی حلقوں میں زبردست خراجِ تحسین حاصل کر رہی تھی۔

(۵۶) ڈاکٹریٹ کے لباس میں علامہ کی ایک دلکش تصویر۔

(۵۷) پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے علامہ اقبال کو ۱۹۳۳ء میں اُن کی اعلیٰ علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر آف لٹریچر D. Litt. کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔

یہ تصویر اسی یادگار موقع کی ہے۔

(۵۸) علامہ اقبال ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کے پہلے اجلاس کے موقع پر۔ ادارے کے عہدیداروں اور معاونین کے ساتھ۔

پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے، بائیں سے دائیں:

خان بہادر سید مقبول شاہ۔ پروفیسر محمد اقبال، سیکریٹری۔ خان بہادر ملک زمان مہدی خان۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، صدر مجلسِ استقبالیہ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال، صدر۔ حبیب الرحمٰن خان شروانی۔ سر عبدالقادر۔ علامہ عبداللہ یوسف علی اور پروفیسر احسان مسیح حقی۔

دوسری صف، بائیں طرف سے:

پروفیسر محمد شفیع۔ ایم۔ اسلم۔ شیخ عظیم اللہ۔ ایم یو۔ کیو شروانی

ڈاکٹر منصور احمد - مولوی غلام محی الدین قصوری - ملک برکت علی

مسٹر غلام محمد - پروفیسر اے - حمید - ڈاکٹر بی - اے قریشی -

تیسری صف، بائیں سے دائیں :

مولوی مرتضیٰ حسین - شمس العلماء محمد عبد الرحمٰن (دہلی یونیورسٹی) ڈاکٹر ایم - صدیق - ڈاکٹر عبد العلیم (جامعۂ ملیہ) - پروفیسر اے - ایل تیش - پروفیسر مولوی ظفر اقبال - مسٹر محمد حسن (والدِ بزرگوار ممتاز حسن) - کے - ایل قاضی فضل حق -

پروفیسر محمد دین تاثیر - نذیر احمد -

پچھلی قطار میں بائیں سے دائیں :

پروفیسر ایچ - ایم شیرانی - ایم - اے چغتائی - ڈاکٹر حسین ہمدانی ڈاکٹر عنایت اللہ - پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم - ڈاکٹر اظہر علی - پروفیسر ڈاکٹر سعید اللہ - جناب ممتاز حسن (موجودہ مینیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان) - ایس - ایم عبد اللہ - پروفیسر ایس عبد القادر - پروفیسر علم الدین سالک - (۱۶ اپریل)

۱۹۳۴ء

(۵۹) شلوار اور کوٹ پہنے ہوئے علامہ کی یہ دلچسپ تصویر ان کے صحتمند دور کی تصویر ہے - اس کے بعد ان کی صحت تیزی سے خراب ہونا شروع ہو گئی -

۱۹۳۵ء

(۶۰) علامہ صوفے پر ایک خاص انداز میں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتے تھے، جن لوگوں کو علامہ کی صحبتوں اور مجلسوں میں حاضر ہونے کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ اُن کے لیے یہ تصویر خاص طور پر دلچسپ ہے۔

(۶۱) صوفے پر بیٹھے ہوئے مسکراہٹ کا ایک اور دلچسپ انداز۔

۱۹۳۷ء

(۶۲) علامہ نے زمانۂ علالت کی وہ تصویر جب وہ آخری مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں تشریف لے گئے۔ شلوار اور لمبا کوٹ۔ چہرے پر گہری سنجیدگی اور متانت ــــ شخصیت اور فن کی تکمیل۔

(۶۳) ۱۹۳۷ء میں جامعۂ ازہر مصر کے علماء و ماہرینِ تعلیم کا ایک وفد ہندوستان آیا تھا اور اس وفد کے اعزاز میں مسلمان علماء و دانشوروں نے کئی تقاریب منعقد کی تھیں۔ اس تصویر میں علامہ سر محمد اقبال علماء ازہر کے ہمراہ پہلی صف میں بائیں طرف سے تیسرے نمبر پر بیٹھے ہیں۔ اُن کے پیچھے علامہ کے صاحبزادے جاوید اقبال کھڑے ہیں۔ دوسری صف میں کھڑے ہوئے پہلے نمبر پر چودھری محمد حسین اور چوتھے نمبر پر خلیفہ شجاع الدین مرحوم۔

(۶۴) سر راس مسعود مرحوم ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک ریاست بھوپال میں اقامت گزیں رہے۔ اس دوران میں علامہ اقبال کئی بار اُن کے ہاں

جاکر قیام فرماتے رہے۔ مختلف بیماریوں کے دباؤ سے علامہ کی صحت دن بدن خراب ہورہی تھی۔ اس لیے وہاں جاکر علاج معالجے کا سلسلہ جاری رہتا اور اکثر بستر پر دراز رہتے۔ یہ تصویر علامہ کے قیام بھوپال کی یادگار تصویر ہے۔ (لیڈی راس مسعود نے تصدیق کی ہے کہ یہ تصویر اُن کی رہائش گاہِ بھوپال کی ہے۔)

۱۹۳۸ء

(۶۵) جاوید منزل لاہور کا وہ کمرہ خاص، جہاں علامہ اقبالؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ محفلِ اقبال کی ہنگامہ آفرینیاں اور بے تکلف احباب کے قہقہے اسی یادگار فضا میں آنسو بن کر تحلیل ہو گئے۔

(۶۶) ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ محمد اقبال اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے عقیدت مندوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر علامہ کی قیام گاہ کی طرف اُمنڈ پڑا۔ اجتماع ہر لمحے بڑھ رہا تھا۔ جب "جاوید منزل" سے علامہ کا جنازہ روانہ ہوا تو اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ اس تصویر میں سوگواروں کا ہجوم اس مقام پر ہے، جس کے پس منظر میں اسلامیہ کالج نظر آتا ہے۔

(۶۷) اپنے عہد کے سب سے بڑے مفکر اور درویش شاعر کی آرام گاہ، جو آج دُنیا بھر کے سربراہانِ مملکت اور اربابِ علم و دانش کی زیارت گاہ ہے۔

(۶۸) لاہور کی عظیم الشان بادشاہی مسجد کے زیرِ سایہ مرقدِ اقبال کا روح پرور منظر۔



99


۲
امرتسر
سنة ۱۹۰۱




CAUT


۵




ہائیڈل برگ
سنہ ۱۹۰۶ء

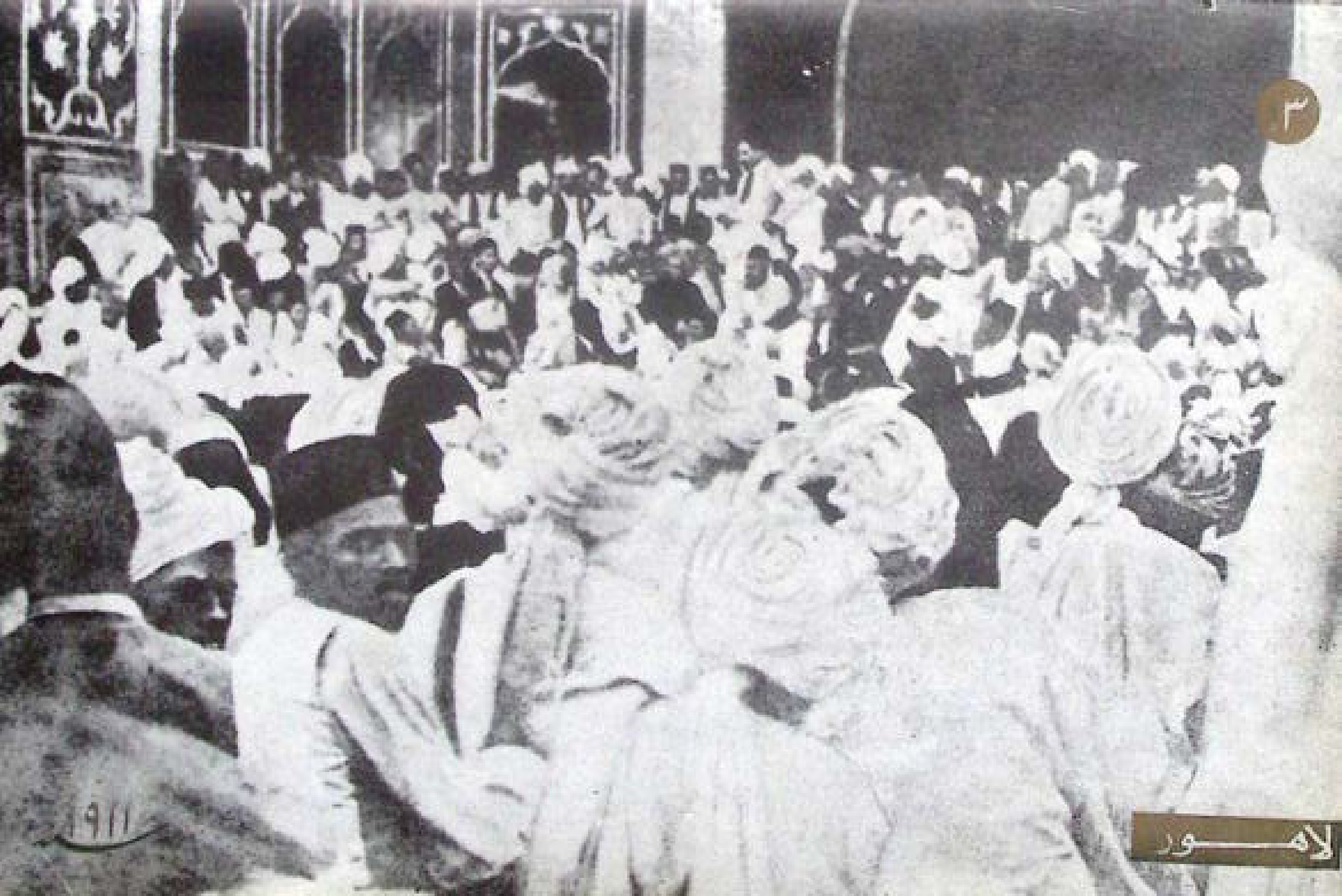



ميونخ




سنه ١٩٠٦




۳
۱۹۱۱
لاہور


وشیارپوری
سنہ ۱۹۱۱ء



لاهور






١٩٢٢ء
لاهور



۱۹۲۲ء
شملہ




۲۱


سنة ١٩٢٦


سنہ ۱۹۲۶ء
مرتسر



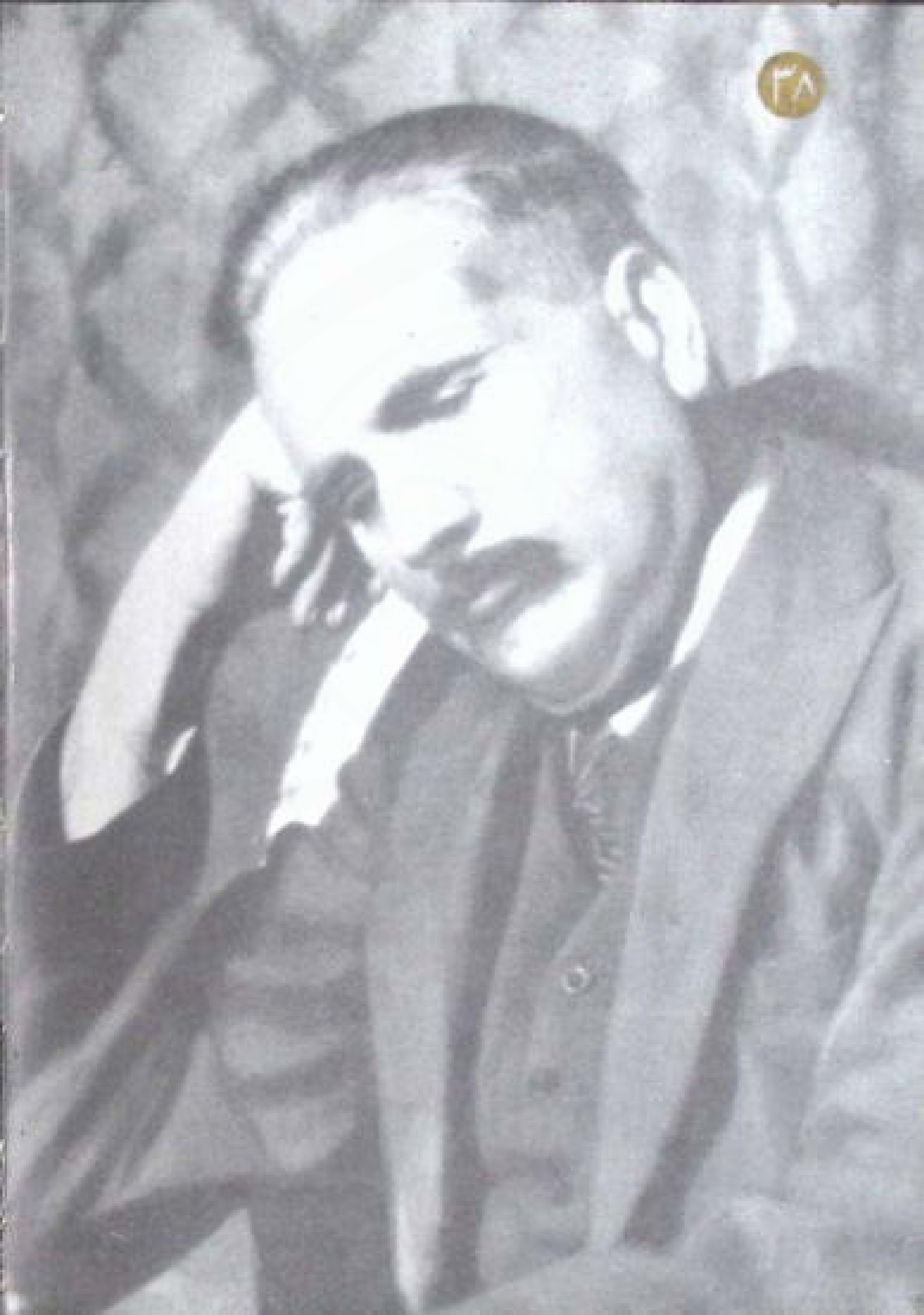

١٩٣٠






۱۹۳۱


۳۷

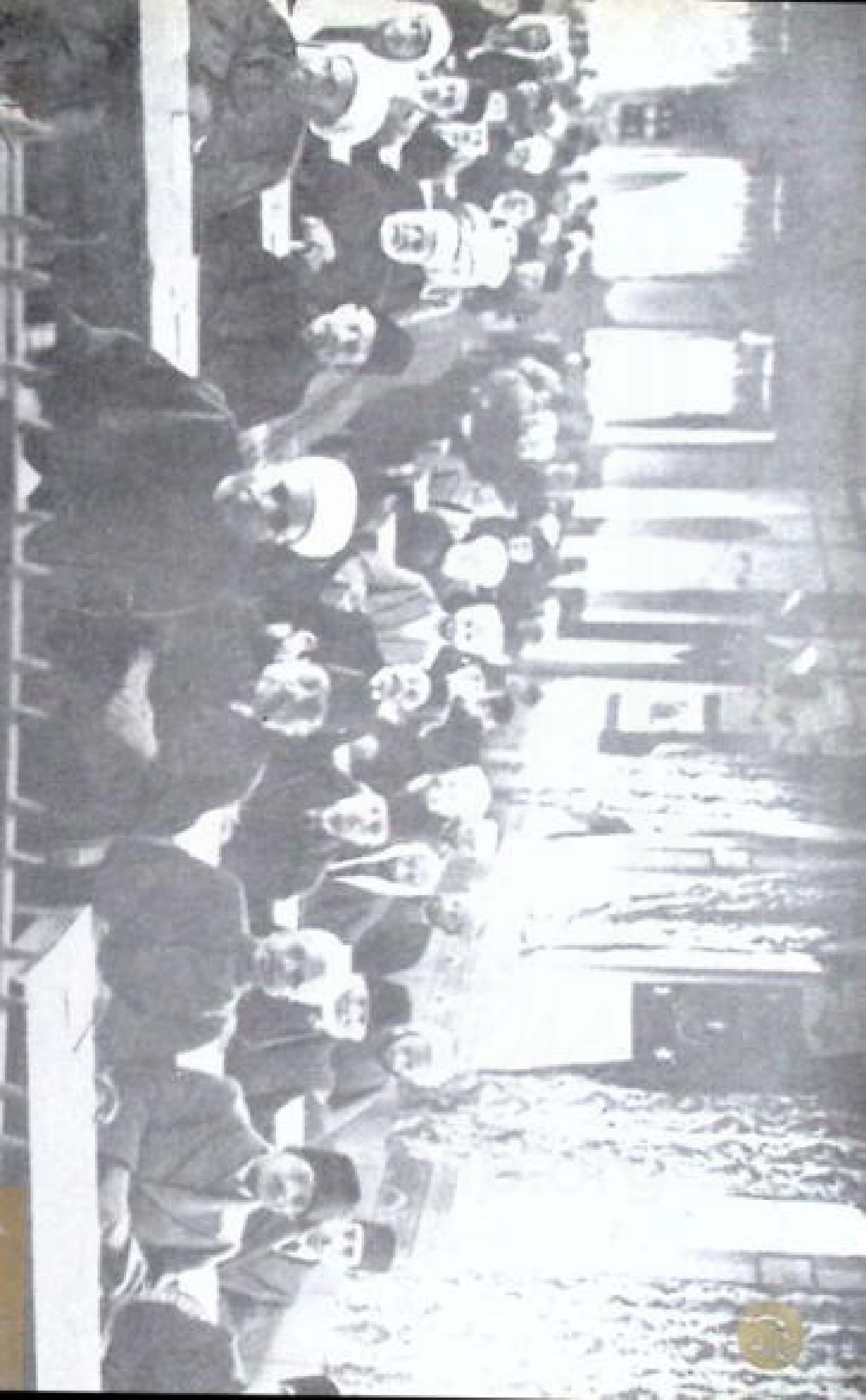


۲۹






المقدس




١٩٣١ء

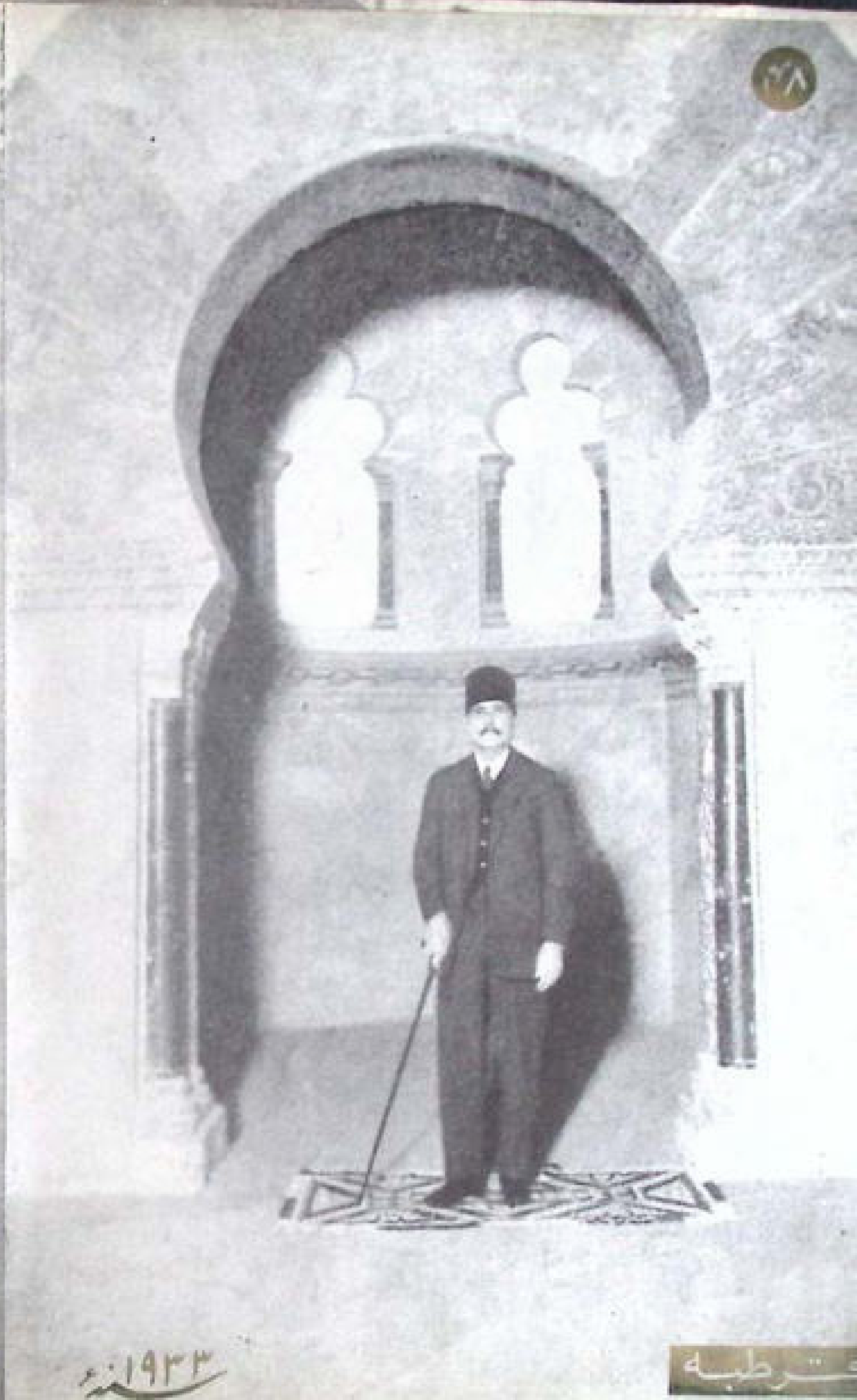








۳۴
لندن
سنہ ۱۹۳۲ء



قرطبة


سنة ١٩٣٣



لاہور


۱۹۳۳ء



۱۹۳۳ء


۵۳
کابل
سنة ۱۹۳۳




۱۹۳۲ء




۵۰
۱۹۳۳ء










۹۲
لاہور


٢٢
سنة ١٩٣٦



